مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ؒ

اور

تصوّف

شمیم طارق

www.abulhasanalinadwi.org

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور تصوف

نام مصنف : شمیم طارق

مصنف کا پتہ : Flat No 27, 4th Floor
Marzban Mansion, Byculla Fruit Market,
Mumbai 400 027

صفحات : ۴۰

قیمت : بیس روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : حافظ جاوید یوسف، غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرز، فون 2663495/2621240

ناشر : فرینڈس آف لٹریچر اینڈ جرنلزم
۳۷/۳۱۷، باپٹی روڈ (ویسٹ)، ممبئی۔۴۰۰۰۰۸

اشاعت اول : نومبر ۲۰۰۰ء

تعداد : ایک ہزار

مطبع : ادبی پرنٹنگ پریس، صابو صدیق پالی ٹیکنک، شیفرڈ روڈ ممبئی ۸

ملنے کے پتے

۱) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، علی گڑھ، اور
پرنس بلڈنگ، جے جے اسپتال، ممبئی ۳

۲) فاران بکڈپو، مقابل نور اسپتال، محمد علی روڈ، ممبئی ۳

۳) فرینڈس آف لٹریچر اینڈ جرنلزم
۳۷/۳۱۷، باپٹی روڈ (ویسٹ)، ممبئی ۸

www.abulhasanalinadwi.org

پیش لفظ

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن فتحپوری مدظلہ العالی

ہمارے علمی مباحث میں جہاں تصوف ایک اہم اور وسیع موضوع ہے وہیں یہ انتہائی مختلف فیہ موضوع بحث بھی ہے۔ اسلام سے تصوف کا کیا تعلق ہے؟ کتاب و سنت میں اس کی بنیادیں ملتی ہیں یا نہیں؟ اس کی تعلیمات اسلامی ہیں یا اسلام سے ان کا کوئی علاقہ نہیں؟ کیا یہ اسلام کے خلاف کوئی سازش ہے؟ تاریخ اسلام کے مشہور متصوفین کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا وہ سب یا ان میں سے بعض در پردہ کچھ اور مقاصد بھی رکھتے تھے؟ صدیوں سے یہ بحثیں ہوتی چلی آئی ہیں اور جب تک اظہار فکر کی آزادی حاصل ہے ان مباحث پر خامہ فرسائیاں ہوتی ہی رہیں گی۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک نے تصوف کی اپنے طور پر ایک تشریح کی اور اس کے مطابق تصوف اور متصوفین پر حکم نافذ کر دیا۔ کچھ حضرات تو اسے یونانی علم الاصنام اور عجمی رہبانیت کا مرقع ظاہر کر کے تمام صوفیاء کو قابل گردن زدنی اور تصوف کے نام لینے والوں کو گمراہ بلکہ خارج از اسلام سمجھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے طبقے تصوف ہی کو اصل اسلام کی حیثیت دیتے ہیں اور اس کے مخصوص اشغال اور خصوصی تعلیمات کو اسلام کی روح بتاتے ہیں، بھلے یہ کتاب و سنت کی نصوص سے متعارض ہوں۔ ان کے یہاں شریعت سے بڑھ کر طریقت اور طریقت سے بڑھ کر حقیقت کا مرتبہ ہے۔ چنانچہ بعض گمراہ فرقوں کے مذہبی لٹریچر میں علم التاویل اور علم الحقیقۃ کے نام سے مستقل علوم ہیں جن کی اجنبیوں اور نااہلوں کو ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی۔ خیر یہ تو وہ لوگ ہیں جن کا سواد اعظم سے کوئی تعلق نہیں لیکن سواد اعظم میں شامل سمجھے جانے والوں میں بھی ایسے کئی لوگ اور مذہبی گروہ مل جاتے ہیں جو شریعت کو پوست اور حقیقت کو مغز قرار دیتے ہیں اور جن کے یہاں تصوف کے نام پر ان کے خود ساختہ اشغال اور رسوم ہی کو ولایت کے حصول کا اصل ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس افراط و تفریط کے درمیان اہل حق کی جماعت ہے جس نے اعتدال کی راہ اپناتے ہوئے نہ تو تصوف کو کلیتہً گردن زدنی قرار دیا نہ اس نام پر پھیلائے گئے غیر اسلامی نظریات اور خود ساختہ اشغال و رسوم کی تائید کی ہے۔ اس جماعت نے وہی کہا جس کی بنیادیں کتاب و سنت میں موجود ہیں اور تصوف کے نام پر شریعت سے انحراف اور غیر اسلامی نظریات کو سرے سے مسترد کر دیا ہے۔ یہ اہل حق کی جماعت ہے جو صرف تزکیۂ نفس کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے ہوئے تصوف کی قائل ہے اور اس میں شک نہیں کہ تزکیہ کو بطور ایک مقصد کے خود قرآن نے تسلیم کیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے حدیث پاک میں اس کو احسان کا نام دیا گیا ہے جس کی تشریح خود ایک روایت میں اس طرح کی گئی ہے کہ آدمی اس طرح ذات باری کے تصور میں مستغرق ہو کر عبادت کرنے لگے گویا وہ خداوند پاک کو دیکھ رہا ہے ورنہ کم از کم یہ تو ضرور ہو کہ اللہ تو یقیناً

www.abulhasanalinadwi.org

نگراں ہے۔ یہی ہمارے بزرگوں کے نزدیک تصوف کا ماحصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتباع سنت اور اخلاص کو تصوف کی روح قرار دیتے ہیں اور جہاں اس سے انحراف پایا جاتا ہو، اسے برملا گمراہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ بھی ہمارے بزرگوں کے اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں وہ صوفیاء کے ایک عظیم خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی صحیح تصوف کو اپنا کر تزکیۂ نفس اور اسلامی کردار سازی سے مربوط تھے۔ کئی اکابر سے اجازت حاصل تھی اور اس سلسلے کے متعدد لوگوں سے ان کا جو والہانہ تعلق تھا اس پر ان کی متعدد تصانیف (مثلاً صحبتے با اہل دل، تذکرہ فضل رحمٰن گنج مرادابادی اور تاریخ دعوت و عزیمت وغیرہ وغیرہ) شاہد ہیں۔

پیش نظر مقالہ اس موضوع پر معتبر صحافی، محقق اور ادیب جناب شمیم طارق کی بہترین کاوش ہے۔ اس میں انہوں نے جو بات کی ہے موضوع کا حق ادا کرتے ہوئے اور ٹھوس علمی حوالوں کے ساتھ کی ہے اور بڑی چابک دستی کے ساتھ مختصر طور پر تمام ضروری پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ دریا بہ کوزہ کے مصداق یہ ایک کتاب کئی کتابوں پر بھاری ہے اور اگرچہ اس کتاب میں تصوف پر مولانا علی میاں ندویؒ کے افکار کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اس کے باوجود اس کی حیثیت تصوف پر ایک مستقل کتاب کی ہے۔

یہ مقالہ انجمن اسلام ممبئی کے زیر انتظام منعقد ایک سیمینار میں پڑھا گیا تھا اور اسی صورت میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مجلّہ نوائے ادب میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ بعد میں بزم صدیق کی خواہش پر اس میں کچھ اضافے کئے گئے ہیں۔ بزم صدیق ہی اس کو شائع کرنے کی بھی خواہش مند تھی مگر "فرینڈس آف لٹریچر اینڈ جرنلزم" کے نوجوان دوستوں کے جذبہ اخلاص کو دیکھتے ہوئے اشاعت کا حق انہیں تفویض کر دیا گیا۔

محض مطالعہ کے زور پر یعنی قلبی اور عملی شغف کے بغیر ایسی موثر تحریر ممکن نہیں ہوا کرتی۔ نام نہاد متصوفین محض وضع قطع اپنا کر عوام کو دھوکے میں مبتلا رکھتے ہیں لیکن شمیم طارق صاحب کے متعلق ہمارا مشاہدہ ہے کہ وضع قطع میں تکلف اور تصنع کرنے کے بجائے انہوں نے عملی زندگی میں تزکیۂ نفس کو ترجیح دی ہے اور وہ اس راہ کے قریبی کوچہ نوردوں میں سے ہیں۔

مقالے میں جماعت اسلامی اور جماعت اہل حدیث کے متعلق بھی بہت اہم باتیں سامنے آئی ہیں جو قارئین کے لئے خاصی مفید ثابت ہونگی۔

خاکسار حضرت مولانا علی میاںؒ کے اس قول سے متفق ہے کہ علماء اور صوفیاء کو ایک دوسرے کی رفاقت کی ضرورت ہے مگر اس رفاقت کے لئے ہم ایسی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہوں۔ یہی اس مقالے کا مغز بھی ہے اور فاضل مقالہ نگار نے اس کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عمومی حیثیت میں تصوف ایک عالمگیر جمالیاتی تحریک یا رجحان ہے جس کا مقصد تزکیہ و تصفیہ، ریاضت و مجاہدہ یا جوگ و نوفلاطونی فلسفہ کے ذریعہ باطن کو رذائل سے پاک کر کے فضائل سے آراستہ کرنا ہے۔ غیر مسلموں نے بھی جن میں ملحدین و منکرین بھی شامل ہیں، اس لفظ کی دہائی دی ہے حتیٰ کہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ مارکسزم بھی جو بے روح مادیت کا علمبردار ہے، اپنے تصوف کی تلاش میں ہے[1]

ایرانی عالم سعید نفیسی نے 'سرچشمہ تصوف در ایران' میں تاریخ تصوف، بعض مقبول و معروف صوفیا کے نسبی اعتقادی پس منظر اور تصوف کے بنیادی نکات پر بحث کرتے ہوئے اس کی تعلیمات کا منبع بودھ مذہب کو قرار دیا ہے۔ زرتشتی اور بودھ مت کی تعلیمات کے تانے بانے ملائے ہیں اور ایران و ہندوستان کے آریوں کے بارے میں یہ لکھنے کے ساتھ کہ وہ اپنے علاقہ سے نکلنے سے پہلے ایک ہی ساتھ رہتے اور زندگی بسر کرتے تھے، انہوں نے دونوں ملکوں کی مشترکہ میراث خصوصاً مذہبی یکسانیت کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایران کا مذہب ساسانیوں کے زمانہ سے ہی بودھ مت کی تعلیمات سے متاثر تھا اور اسلام آنے کے بعد بھی وہ اثرات اندرونی طور پر باقی رہے۔ اسی لئے قدیم ایرانی صوفیا کے اقوال بودھوں کے اقوال سے ملتے جلتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں تصوف کی ابتداء اور مزاج کے بارے میں ایسی باتیں ہیں جن کو فوری طور پر ذہن قبول نہیں کرتا اور چونکہ سعید نفیسی کی کتاب میں بہت سی باتوں کے حوالے بھی نہیں ہیں اس لئے اس کی تلخیص کرتے ہوئے پروفیسر کبیر احمد جائسی بار بار چونکے ہیں اور بالآخر اس صائب رائے کا اظہار کیا ہے کہ

> "اگر سعید نفیسی کا پیش کیا ہوا یہ نظریہ تحقیق کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو ہم کو تصوف کے موضوع پر از سر نو نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور اس میں سے اسلام دشمنی کی روح کو نکال پھینکنا ہوگا"[2]

کبیر احمد جائسی نے مندرجہ بالا خیال کا اظہار سعید نفیسی کے اس موقف کے جواب

۱۔ ظ انصاری، اقبال کی تلاش ص ۱۸۸

۲۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف ص ۱۱

www.abulhasanalinadwi.org

میں کیا ہے کہ ایرانی تصوف شعوبیت کی انتہائی شکل ہے یعنی ایران میں جو تصوف برگ و بار لایا اس کا اصل مقصد عرب بہ الفاظ دگر اسلام کے اعمال وافکار کو ایرانیوں کی زندگیوں اور دلوں سے نکال پھینکنا تھا اور یقیناً یہ ایسی بات ہے جس پر سبھی کو حیرت ہو گی لیکن دوسری تیسری صدی ہجری میں مختلف یہودی عیسائی فرقوں کی تعلیمات و تحریکات، مسلمانوں پر نوفلاطونی فلسفہ کے اثرات، ہندوستانی مذہبی فلسفوں یعنی ویدک اور بودھ مت سے تعلق رکھنے والی کتابوں کے عربی تراجم کی مقبولیت اور پھر اسمٰعیلی باطنی تحریکوں کی مختلف ذیلی شاخوں کے پھیلائے ہوئے رجحانات اور علم تاویل کے زیر اثر نئے عقیدہ اور اسلوب کی ایجاد پر نظر رکھنے والوں کے لئے سعید نفیسی کا یہ لکھنا باعث حیرت نہیں ہے کہ

> ”صوفیہ نے ہمیشہ در پردہ گفتگو کی ہے۔ ان کے پاس اس بات کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنی بیشتر باتوں کو اشاروں کنایوں، رموز اصطلاحوں اور جس چیز کو وہ شطحیات کا نام دیتے ہیں یعنی وہ چیز جو بظاہر تو پراگندہ اور بے ربط تعبیر معلوم ہوتی ہے مگر باطنی طور پر انتہائی دقیق، لطیف اور پر مغز تعبیرات کی حامل ہوتی ہے، کے ذریعے بیان کریں۔ وہ حقیقت جو بزرگان تصوف کے دلوں میں جاگزیں تھی ان کا بیان کرنا اس قدر دشوار تھا اور مصلحت وقت کے بھی خلاف تھا۔ ان میں کچھ لوگوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اور کبھی کبھی دیوانے کے نام سے بھی موسوم ہوئے۔ ان کفر آمیز باتوں کا سب سے بہترین نمونہ منصور حلاج کی باتیں ”زبدۃ الحقایق“، ”تمہیدات“، ”یزدان شناخت“، شکوی الغریب عن الاوطان الی علماء البلدان“ اور ان کے ”مکاتیب“ میں مندرج عین القضاۃ ہمدانی کی باتیں، ”المحبوب“، ”قلب المنقلب“، ”تنجیل الارواح“ میں سعد الدین حمویہ کی باتیں، ”رسالۃ القدس“، ”کتاب الانوار“ اور تفسیر عرائس میں مندرج روز بہان بقلی کی باتیں اور مولانا جلال الدین بلخی (مولانا روم) کی مثنوی کی بعض باتیں ہیں۔ ان ”شطاح“ صوفیہ میں سے بعض وہ لوگ جنہوں نے در پردہ باتیں نہیں کہی ہیں ان کی باتیں کبھی کبھی بہت روشن اور واضح ہوتی ہیں۔ خاص طور سے فارسی شعر میں انہوں نے اس طرح کی جو باتیں کہی ہیں وہ اس کا بہت دلچسپ نمونہ ہیں۔“[1]

۱۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف ص ۳۲-۳۳

www.abulhasanalinadwi.org

اور نہ ہی یہ لکھنا کہ

"ایرانی تصوف اپنی ابتدا میں صرف طریقت کے پہلو کا حامل تھا اور شریعت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں رہا تھا جیسا کہ ان ابتدائی کتابوں میں جن کو ایران کے صوفیوں نے تالیف کیا ہے، انہوں نے عبادات اور فرائض کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی شریعت کے مسایل پر بحث کو درمیان میں لائے ہیں۔ اس سلسلے کی بہترین سند جو ہماری دسترس میں ہے ایرانی صوفیوں کی تصانیف ہیں۔ ان کتابوں کی فصلوں اور بابوں (کے مطالعے) سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے وسط تک ایران کے صوفیوں نے شریعت اور طریقت کو ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست نہیں کیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط تک کی ایرانی تصوف کی کتابوں کے اہم ترین مباحث اسی طرح ہیں۔"[1]

"تصوف پر ایرانی عجمی اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی ایسے "صاحبان طریقت" مل جاتے ہیں جن کی بزرگی و کرامت کا سارا انحصار شریعت کی مخالفت پر ہے۔ سعید نفیسی نے ادوار اور علاقوں کے اعتبار سے تصوف کی تاریخ پر جس طرح نظر ڈالی ہے مجموعی طور پر وہ بھی معلومات افزا ہے اور تاریخ مذاہب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو محتاج تصدیق ہو۔

"تصوف کو تین شاخوں اور تین علاقوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ عراق اور جزیرہ[2] کا تصوف جو نستوری نصرانیوں، یعقوبیوں، صابئیوں، مرقیوں (Mercoon)، ابن دیصان اور ہرمس (Hermes) کی تعلیمات سے متاثر ہوا ہے۔ ایران اور ہندوستان کا تصوف جو ایرانی زردشت، مانی اور ہندوستانی بودھ کی تعلیمات سے مستعار لیا گیا ہے اور مصر، شام، مغرب اور اندلس کا تصوف جو نو فلاطونیوں، یہودیوں، اسکندرانی فلسفیوں کی تعلیمات سے متاثر ہوا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایرانی تصوف جس کو "مشرقی تصوف" بھی کہا جا سکتا ہے، اس علاقے میں بلخ میں برگ و بار لایا جہاں اب بھی بدھ مت کے ماننے والے رہتے ہیں اور اگر

۱۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف ص ۴۷

۲۔ یہ وہ سرزمین جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

(اس علاقے میں) مسلمانوں نے ان کو نابود بھی کر دیا ہے تب بھی وہاں ان کے آثار زندہ وپایندہ ہیں۔ ایرانی تصوف کے ابتدائی دور کے تین عظیم ترین پیشوا بلخ کے ہی رہنے والے تھے۔ ابواسحٰق ابراہیم بن ادہم بن سلیمان بن منصور متوفی ۱۶۱یا۱۶۲یا۱۶۶ھ ابو علی شقیق بن ابراہیم بلخی متوفی ۱۷۴ھ اور ابو عبدالرحمٰن حاتم بن عنوان اصم معروف بہ حاتم اصم متوفی ۲۳۷ھ (جو کچھ ہم نے کہا ہے) اس کے ثبوت کے لئے سب سے اہم دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ ایرانی تصوف میں مراحلِ سیر و سلوک کو ہر چیز پر اولیت حاصل ہے اور ہمارے تصوف کی جتنی بھی شاخیں ہیں ان میں یہ چیز ملتی ہے۔ بہت سی شاخوں میں یہ مراحل سات درجات پر مشتمل ہیں۔ یہ طریقہ مانوی طریقے کے بالکل مطابق اور بودھی طریقے سے ذرا سا مختلف ہے۔"[۱]

امام غزالیؒ سے پہلے تصوف کا جو عمومی مزاج رہا ہے یا جو غیر اسلامی باتیں تزکیہ واحسان کے ساتھ خلط ملط ہوتی رہی ہیں، شریعت کی روشنی میں ان کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے مطالعۂ تصوف میں دلچسپی رکھنے والوں نے امام غزالیؒ سے پہلے کے تصوف اور بعد کے تصوف میں فرق کیا ہے اور اس فرق کو سعید نفیسی نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہی اعتراف ان کی تحقیق کا سب سے اہم نکتہ ہے۔

کبیر احمد جائسی کے لفظوں میں،

"سعید نفیسی کے نزدیک حجۃ الاسلام ابو حامد محمد غزالیؒ طوسی (متوفی ۵۰۵ھ) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شریعت و طریقت کو باہم دگر تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں شریعت و طریقت کے مباحث کو ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست کیا ہے۔ امام غزالی کی کتاب کیمیائے سعادت میں بھی انکی یہ روش برقرار ہے۔ علاوہ بریں ایک اور کتاب "مكاشفة القلوب المقرب الى حضرة علام الغيوب" جو ان کے نام سے منسوب ہے، مگر سعید نفیسی اس کو ان کی تصنیف نہیں مانتے، اس کے مباحث کو بھی انہوں نے نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امام غزالی کی شریعت

۱۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف، ص۲۸۔ ۲۹

www.abulhasanalinadwi.org

وطریقت کی تطبیق کی روش مقبول ہوئی اور چھٹی صدی ہجری کی تصوف کی کتابوں میں ان کی اس روش کا عکس صاف نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے محی الدین ابو محمد عبدالقادر گیلانی (م ۵۶۱ھ) کی کتاب "فتوح الغیب" اور "الغنیۃ لطالبی طریق الحق عزوجل" ضیاء الدین ابو نجیب عبدالقاہر ابن عبداللہ محمد بن عبداللہ عمویہ سہروردی (م ۵۶۳ھ) کی کتاب "آداب المریدین"، شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ عمویہ بکری سہروردی (م ۶۳۲ھ) کی کتاب عوارف المعارف، عزالدین محمود بن علی کاشانی نطنزی (م ۷۳۵ھ) کی کتاب "مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ" کی فہرست مباحث نقل کر کے ان کو اپنے ثبوت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایران کے دو صوفی شاعروں سنائی اور عطار کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ ان شعراء نے مراتب وسلوک کو کتنے درجات میں تقسیم کیا ہے۔ انہوں نے سنائی کی کتاب "سیر العباد الی المعاد" اور عطار کی 'منطق الطیر' کے مباحث کی فہرست نقل کر کے مراتب سیر وسلوک کی پوری تفصیل قلم بند کر دی ہے۔ ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے وسط تک ایرانی تصوف میں شریعت کا کوئی عمل دخل نہ تھا اور یہ خالص طریقت کا مبلغ ومناد تھا۔ امام غزالیؒ نے سب سے پہلے طریقت وشریعت کو باہم دگر تطبیق دی اور ان کے بعد کے صوفیا انہی کے نقش قدم پر گامزن ہوئے۔"[1]

سعید نفیسی نے امام غزالیؒ سے پہلے کے تصوف میں شریعت وطریقت کی مغایرت کے بارے میں مجموعی طور پر جو باتیں لکھی ہیں وہ ایران کے علاوہ دوسرے علاقوں کے تصوف میں بھی ایک زمانہ تک موجود تھیں۔

آج بھی تصوف کو اسی نگاہ سے دیکھنے والے لوگ اور گروہ موجود ہیں جس نگاہ سے پانچویں صدی ہجری کے وسط سے پہلے کے ایرانی صوفیاء دیکھا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری کی یہ سطور پیش کی جا سکتی ہیں:

"عشق اور دل دو لفظ ہیں جو اس تصور کا پوری طرح احاطہ کر لیتے

۱۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف، ص ۴۷۔۵۷

www.abulhasanalinadwi.org

ہیں۔ عشق سب سے بڑا جذبہ ہے اور دل سب سے بڑی چیز۔ کعبہ ہو یا مندر اور مسجد، یہ اگر ٹوٹ جائیں تو پھر بن سکتے ہیں لیکن دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے۔ حج، نماز روزے سے کوئی آدمی نہیں بنتا۔ یہ ظاہری عبادتیں ہیں۔ آدمی دل سے بنتا ہے اور دل پیر و مرشد ہے، عشق کا مرکز ہے۔ خدا ہے۔ عشق اس کائنات کا خالق ہے۔ اس کا رنگ روپ ہے۔ عشق ہی جلاتا ہے۔ عشق ہی مارتا ہے۔ ۔ ۔ اس طرح خدا اور انسان کا براہ راست رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف انسان سے محبت کر کے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے آنکھیں بند کر کے مراقب ہونا، بندے کے درد دل کو بھول کر خدا رسیدہ بننا بے کار ہے۔[1]

تصوف کے مزاج و تاریخ کے بارے میں بھی علی سردار جعفری نے جو رائے دی ہے وہ اسی گروہ کی رائے پر مبنی ہے جو تصوف کو قید شریعت سے ماورئی سمجھتا ہے۔

"پیغمبر اسلام کی وفات کے تیس سال کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ جو رحمت اور شفقت بن کر آیا تھا، اس کے نام پر مصر سے لے کر ایران اور دریائے سندھ کے ساحلوں تک فوجی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پانی اور زمین پر انفرادی قبضہ ہو گیا اور اسلامی دنیا مکمل جاگیر دارانہ نظام میں تبدیل ہو گئی اور جاگیرداری شہنشاہیت نے خلافت کا تاج سر پر رکھ لیا، اب بقول اقبال کے شام اور بغداد کی شوکت ایک طرف تھی اور ساحل فرات پر بہتر پاک روحوں کی شہادت دوسری طرف۔

ایں دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

عرب کے فاتحین مشرق اور مغرب کے ممالک کو فتح کر رہے تھے، لیکن مشرق و مغرب کے علوم اور فلسفے عربوں کو شکست دے رہے تھے، ایران میں غلاموں، کسانوں اور دستکاروں کی بغاوتیں ہو رہی تھیں اور بغداد کے عربی دربار میں ایرانی امراء کا اقتدار بڑھ رہا تھا، عباسی خلفاء کی سرپرستی میں یونانی علوم اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے،

۱۔ علی سردار جعفری، پیغمبران سخن ص ۹۷۔۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

افلاطون اور ارسطو کے نام عربی انداز اختیار کررہے تھے۔ اوران کی سلطنت کے گوشے گوشے سے اخوان الصفااور معتزلہ عقل پرستی اور ذہنی وسعت کا پیغام دے رہے تھے۔

عرب اقتدار کی جاگیرداری گرفت جتنی سخت ہوتی جاتی تھی۔ایرانی دانش وروں اور شاعروں کی آوازیں اتنی ہی بلند ہوتی جارہی تھیں۔ فردوسی، ناصر خسرو اور عمر خیام کی شاعرانہ نوا سنجی جاگیرداری فکر کے مستحکم نظام میں شگاف ڈال رہی تھی اور ابو علی سینا کی فکر ایک نئے نظامِ حیات کی بشارت لئے ہوئے تھی۔اب ایران کا خطہ ایک میخانہ تھا، جس میں ایک طرف سے ویدانت ، اپنیشد اور بودھ تصورات کا آبِ حیات اور زرتشتی اور مزدکی شراب میں مل جانے کے بعد دو آتشہ سہ آتشہ تیار ہورہا تھا۔ اسلام کئی حصوں میں بٹ گیا تھا، لیکن اس کے اہم ترین حصے دو تھے ۔ ایک سرکاری اور صاحبِ اقتدار طبقے کا اسلام تھا اور دوسرا عوام کا اسلام ۔ ایک شریعت تھا اور دوسرا طریقت ۔ ایک مذہب تھا اور دوسرا تصوف۔ایک ظاہری مذہب تھااور دوسرا باطنی۔ جاگیرداری فکری نظام پر یہ سب سے بڑا حملہ تھا جو بارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مختلف ناموں مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں پھیلا ہوا تھا، کہیں اس کا نام مسٹی سزم تھا ، کہیں تصوف ، کہیں بھگتی، کہیں چی این اور کہیں ژن۔اس کا ظاہری لباس مذہبی تھا لیکن اندرونی اور داخلی حیققت انقلابی اور باغیانہ۔

تصوف قرونِ وسطیٰ میں انسان دوستی کی عظیم ترین تحریک کی شکل میں ابھرا تھا، جس نے رقص و سرود اور شاعری کو حربہ بنادیا تھااور عشق، محبت ، گناہ اور مستی کو روحانی انداز دے دیا تھا،اس کا سب سے بڑا حملہ ان اہل کاروں پر تھا جنہیں سعدی نے شمر ذی الجوشن اور یزید سے تشبیہہ دی ہے،ان میں مذہبی اہل کار بھی تھے جو خدااور بندے کے درمیان حائل تھے ،اور سرکاری اہل کار کبھی کبھی ایک بھی ہو جاتے تھے ۔ سرکاری مذہب کا خدا قہار اور جبار تھااور صوفیوں کا خداانسانوں کے عیوب چھپانے والا، رحیم

www.abulhasanalinadwi.org

وکریم اور شفقت کرنے والا۔ اس لئے صوفی انا الحق کہنے کی بھی ہمت کر لیتا تھا، چاہے اسے دار ہی پر کیوں نہ کھینچ دیا جائے۔[1]

لیکن یہ نقطہ نظر تاریخی اعتبار سے صحیح ہے نہ ہی اعتقادی حیثیت سے، اس میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تصوف کو مجموعی طور پر اسلام یا فاتح اسلام کے رد عمل اور احکام و عبادات کی نفی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بعض ملکوں مثلاً ایران کی قومی تحریکوں اور اسلام مخالف رجحانات نے اپنی پردہ پوشی کے لئے اس لفظ کا استعمال ضرور کیا تھا مگر اس کا حقیقی تصوف سے کوئی واسطہ تھا نہ اسلام سے، اور صوفیاء کرام نے سخت لفظوں میں اس کی مذمت بھی کی تھی۔

سعید نفیسی نے اس کی نشاندہی کرنے کے ساتھ اس کا ایرانی پس منظر بھی بتایا ہے لیکن علی سردار جعفری نے تصوف کے پردے میں اسلام و عرب مخالف تحریک کو تصوف کی ہمہ گیر تحریک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب "ہمعات" میں تصوف کے چار ادوار یا تصوف کے طریقوں میں چار بڑے بڑے تغیرات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا دور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم، آپ کے اصحاب باصفاؓ اور اس کے فوراً بعد کی نسلوں کا دور ہے۔ یہ وہ بزرگ تھے، شرعی احکام کی بجا آوری سے جن کے باطنی تقاضوں کی بھی تسکین ہو جاتی تھی۔

دوسرا دور جنید بغدادی سے شروع ہوا۔ اس دور میں "توجہ" کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔

تیسرا دور شیخ ابو سعید بن ابوالخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانہ سے شروع ہوا اور اس دور میں "جذب" پر خصوصی توجہ دی گئی۔

چوتھا دور شیخ اکبر محی الدین عربی کے دور سے شروع ہوا ہے اور ہر دور کے تصوف کے احوال و اقوال کو اس زمانے کے مطابق جانچا جانے لگا۔

اس کے علاوہ صوفیاء نے مختلف ادوار میں سیاسی اور معاشی جنگوں میں فاتحین کے ساتھ شرکت بھی کی ہے۔ آج بھی چیچنیا کی تحریک آزادی کی قیادت نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ کر رہے ہیں۔

قرآن پاک میں پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف بیان کئے ہیں ان

۱۔ علی سردار جعفری، لکھنؤ کی پانچ راتیں، مقالہ "گردش پیمانۂ رنگ"، ص ۲۔۱۶۱

www.abulhasanalinadwi.org

میں تزکیہ بھی ہے۔ آپؐ کی ساری زندگی فقر کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ آپؐ نے انفاق والعفو کے حکم پر پوری طرح عمل کیا اور کبھی صاحبِ نصاب ہوئے نہ میراث چھوڑی۔ محبوب خدا تھے اس کے باوجود شکر گذاری کے جذبہ سے قائم اللیل اور صائم النہار ہو کر مشقتیں اٹھاتے تھے۔ آپؐ کے رہن سہن، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بھی ہمیشہ سادگی غالب رہی اور آپؐ کی اتباع میں حضرات صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ اور اصحاب صفہؓ بھی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے رغبتی کی زندگی گذارتے رہے لیکن دوسری صدی ہجری میں جب سلاطین میں سے اکثر نے کتاب وحکمت اور تزکیہ کی تعلیم سے منہ موڑ لیا اور مسلم معاشرہ میں دین ودنیا کی تفریق بڑھی تو ان نفوس مطہرہ کی حیثیت نمایاں ہونے لگی جو گوشۂ عافیت کے متلاشی، معرفت حق کے جویا اور دنیاوی اقتدار سے گریزاں تھے مگر ان کے مخالف نہیں تھے جو انصاف واخلاص سے سلطنت یا دین کے کاموں کو انجام دے رہے تھے۔

خانقاہوں، جماعتوں اور سلسلوں کا وجود عمل میں آیا اور انہیں عارفان حق نے تزکیۂ نفس کی تعلیم اور بیعت روحانی کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں یقیناً ان میں ایسے لوگ شامل ہوئے جو نو مسلم تھے یا جنہوں نے دنیا کمانے کے لئے صوفیوں جیسی صورت بنالی تھی یا اسلام کی بیخ کنی کے ارادے سے جماعت صوفیا میں داخل ہو گئے تھے لیکن اچھوں کی صحبت کے سبب ان کی بھی کایا پلٹ ہونے لگی۔ اسلئے سعید نفیسی اگر ایک طرف یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

> "ایرانی صوفیہ کسی قسم کی کوئی نماز کوئی روزہ کوئی عبادت اپنے لئے مخصوص نہیں کرتے تھے"۔[1]

تو دوسری طرف یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ

> "مغرب میں ابن العربی کے تصوف کے عالم ظہور میں آنے کے بعد اس تصوف کے پیروؤں کے ایران سے قریب رہنے کی وجہ سے ابن العربی کے وہ افکار جو اسرائیلی اور مغربی فکر کا آمیزہ ہیں، ایرانی تصوف میں تیزی سے راہ پانے لگے اور ان افکار نے ایرانی تصوف کو زیروزبر کر کے رکھ دیا۔"[2]

ابن العربی کے افکار کے اسرائیلی اور مغربی فکر کا آمیزہ ہونے کی بات بحث طلب

۱۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف، ص ۳۶
۲۔ کبیر احمد جائسی، ایرانی تصوف، ص ۳۹

www.abulhasanalinadwi.org

ہے اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علماء فضلاء محدثین اور مورخین میں چند ایسے لوگوں کا سراغ لگ چکا ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے ہی مسلمانوں جیسی صورتیں بنائی تھیں لیکن ان میں سے ایک یا چند کے غلط ہونے کے سبب تمام علماء فقہاء محدثین اور مورخین کو مسترد نہیں کیا جاتا تو پھر پوری جماعت صوفیہ یا تصوف کو کیونکر مسترد کیا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان استغنا و فقر اور عبادات میں خشوع و خضوع کی حلاوتوں کے حصول کی کوشش کرنے والوں کے وجود سے کوئی دور خالی نہیں رہا ہے اور جب جب تصوف کے نام پر گمراہی پھیلانے کی کوشش ہوئی ہے، خود انہیں صوفیائے کرام نے اپنی صفوں کی تطہیر کا فریضہ انجام دیا ہے اور غیر اسلامی عقیدہ و عمل کے خلاف جہاد کیا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے صوفیاء کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

۱- پہلے قسم کے صوفی اپنی طبیعت سے آزاد ہو کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انہیں "صاحب وصول" کہتے ہیں۔

۲- دوسرے قسم کے صوفی، صوفی کے درجے کو ریاضت و مجاہدہ سے تلاش کرتے ہیں، انہیں "صاحب اصول" کہتے ہیں اور

۳- تیسرے قسم کے صوفی، محض مال و متاع اور حشمت و جاہ کے لئے صوفی کی وضع قطع اختیار کرتے ہیں۔ انہیں "صاحب فضول" کہتے ہیں۔ پہلے قسم کے صوفیاء نے ہمیشہ دوسرے تیسرے قسم کے صوفیاء کی مخالفت کی ہے اور اسی گروہ کے پیغام حق، حب رسول اکرمؐ، تزکیۂ اخلاق، تازگیٔ دل، حقوق العباد پر اصرار، دعوت و عزیمت اور نوائے زندگی کے زیر و بم سے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ عام انسانوں کی معاشرتی اخلاقی روحانی حتیٰ کہ سیاسی زندگی میں بھی ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا ہوئی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا نام امام غزالیؒ کا ہے جنہوں نے سب سے پہلے ان گندم نما جو فروشوں کا تعاقب کیا جو عقیدہ و عمل میں اسلام سے دور ہونے کے باوجود "جماعت صوفیا" کی مقبولیت و محبوبیت کے سبب دوسری صدی ہجری میں اس کے ساتھ خلط ملط ہونا شروع ہو گئے تھے یا قبول اسلام کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں اپنے پرانے عقیدہ و عمل کی پاسداری کر رہے تھے۔ اسی لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جس تصوف کے بارے میں حضرت علی ہجویریؒ کا ارشاد ہے کہ

www.abulhasanalinadwi.org

"سلف صالحین کے زمانہ میں یہ نام موجود نہیں تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی"[1] یا جس تصوف کو خصوصیت سے امام غزالیؒ نے اسماعیلی زوائد اور باطنی عقائد سے پاک کر کے راسخ العقیدہ اسلام میں جگہ دلائی وہ تصوف سلوکِ راہ نبوت ہے اور اس میں قرآن و سنت کی مخالفت یا غیر اسلامی عقائد واشغال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امام غزالیؒ نے تصوف کے بحر بے کنار سے معرفت ربانی کے جو موتی چنے یا امام مجدد کی حیثیت سے اس کو جو خصوصی اسلوب بخشا اس پر مصری دانشور ڈاکٹر احمد امین نے بڑی جامع بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء اور صوفیاء... خصوصاً صوفیاء اور اشعریہ کے درمیان معرکہ آرائی ختم کر کے امام غزالیؒ نے ان متحارب گروہوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا جس کے نتیجہ میں فقہا کی کثیر تعداد نے تصوف کو تسلیم کر لیا اور صوفیا نے فقہا کے نقطہ ہائے نظر کو[2]

ہندوستان میں بھی کثرت سے ایسے علماء اور فقہا ہوئے ہیں جن کی زندگی بیک وقت شریعت و طریقت کا مرقع تھی۔ یہاں عالمی سلاسل مثلاً قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کو تو قبول عام حاصل ہوا ہی، ایسے سلاسل بھی خوب پروان چڑھے جن کے بانی ہندوستانی تھے مثلاً سلسلۂ مجددیہ، سلسلۂ مداریہ، سلسلۂ قلندریہ اور سلسلۂ شطاریہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے دور، تعلیمی نظام اور طرز زندگی کو صوفیاء کرام ہی کی ذات سے استحکام ہوا۔ اب لفظ تصوف سے بدک کر دور کھڑا ہونا صحیح ہے نہ تصوف کو شریعت سے مستثنیٰ کر کے اس کو ایک خود مختار روحانی نظام قرار دیدینا۔ یہ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ، امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ، مرزا مظہر جان جاناںؒ، امام انقلاب شاہ ولی اللہؒ، صاحب سر شاہ محمد کاظم قلندرؒ اور شیخ عرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ.... جیسے نہ جانے کتنے عارفان حق اور پاکباز صوفیا کی اعتقادی، فکری اخلاقی وراثت ہے جس سے عوام و خواص کو حسب حیثیت علم و ہدایت کی روشنی بھی ملتی رہی ہے اور نفس کی تہذیب بھی اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے کیونکہ ولایت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔

لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ولایت و بزرگی کا حصول یا کرامتوں کا ظہور تصوف کا مقصود نہیں ہے۔ تصوف میں سب سے بڑا مقام بندگی و بے نفسی کو مانا گیا ہے، امام ربانیؒ

۱۔ ابوبکر سراج الدین، مقالہ 'تصوف' اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۴۲۹

۲۔ڈاکٹر احمد امین، ظہر الاسلام، ج چہارم

www.abulhasanalinadwi.org

کا قول ہے کہ جن لوگوں سے کرامات کا ظہور ہوا ہے ان لوگوں کی قیامت میں تمنا ہوگی کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔

مولانا سید شاہ ابوالحسن نوریؒ نے لکھا ہے کہ

"صرف خرق عادت سے اولیاء اللہ کو شناخت کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ تو ولی اور غیر ولی میں مشترک ہے یہاں تک کہ کافر اور جادوگر میں بھی۔[1]

اس لئے عارفان حق نے ہمیشہ اس بات کا احساس دلایا ہے کہ جب اپنے نفس پر اللہ کی حکومت نہیں تو پھر دوسروں پر کیا ہوگی! اور وہ ساری توجہ اخلاق و معاملات کو درست کرنے اور نفس کی اصلاح یا اس کو مغلوب کرنے میں صرف کرتے رہے ہیں۔ وہ حاجت براری کے لئے اشغال و اوراد پر اللہ کے کرم کو اور دعا کی مقبولیت کے لئے بزرگی پر دل شکستگی کو ترجیح دیتے رہے ہیں کیونکہ دل کے بغض و حسد، عجب و خود پسندی اور دوسروں کی بدگمانی و بدبینی سے پاک صاف کئے بغیر اس پر تصوف و تزکیہ کا رنگ چڑھ سکتا ہے نہ نفس کی مکمل تہذیب ہو سکتی ہے۔

یہی تصوف کا خلاصہ بھی ہے اور اس خلاصہ کو شیخ سعدیؒ نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

مرا پیر دانائے مرشد شہاب
دو اندر ز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش
دوم آنکہ ہر کس تو بدبیں مباش

میر عبدالواحد بلگرامیؒ نے پیری مریدی کو بھی اسی زاویے سے دیکھا ہے اور نشاندہی کی ہے کہ

"مریدی علم دین سیکھنے اور دل کے چراغ کو علم سے روشن کرنے کا نام ہے، نہ کسی نے مردوں سے کوئی علم حاصل کیا ہے اور نہ کسی کا خاک سے چراغ روشن ہوا ہے"[2]

وضع قطع یا رسم و تبرک پر تصوف کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ جیسے برگزیدہ مرید و خلیفہ کے ہوتے ہوئے

۱۔ مولانا سید شاہ ابوالحسن نوری، سراج العوارف، ص ۶۹
۲۔ میر عبدالواحد بلگرامی، سبع سنابل (اردو ترجمہ)، ص ۱۸۹

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے پیر کے تبرکات کو جو پیر سے مرید کو منتقل ہوتے ہوئے ان تک پہنچے تھے یہ کہکر اپنے ساتھ دفن کر دینے کا حکم نہ دیتے کہ اب ان کے اہل نہیں رہ گئے ہیں۔ تصوف کا مقصود وحاصل نفس کی تہذیب اور دل کی تطہیر ہے جو ایمان، توبہ، صدق، تقویٰ، مجاہدہ، ریاضت نفس، عجزوانکسار، صبر، شکر، تحمل، قناعت، محبت، عفت جیسے بشری محاسن سے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے اور اس کے بعد انسان روحانی مدارج طے کرنے لگتا ہے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بظاہر مورخ و متکلم، داعی، ادیب شہیر، نہایت ذہین وذکی، وسیع العلم عالم ظاہر ہیں مگر ان کے خاندانی پس منظر، روحانی نسبت، بیعت و ارادت اور باطنی احوال و کیفیات پر نظر رکھنے والے انہیں عارف باللہ اور صاحب ذوق و معرفت بزرگ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ عمر بھر نہ صرف اہل دل کی مجلسوں میں حاضری دیتے رہے ہیں بلکہ انہوں نے بزرگوں کی جلوت و خلوت کے احوال بھی بیان کئے ہیں اور اپنی تحریروں میں تصوف و طریقت اور مشائخ کے بے ساختہ تذکروں کے ساتھ اس لفظ کی حقیقت و معنویت کو بھی داد تحقیق دی ہے۔ ان ہی کے لفظوں میں،

> "آپ کے بعد آپؐ کی امت میں آپؐ کے اوصاف میں بہت سے لوگ علیٰحدہ علیٰحدہ اور بعض مجموعی طور پر آپ کے جانشین اور نائب ہوئے اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ بعض کے حصہ میں تلاوتِ کتاب آئی۔ بعض کو تعلیم کتاب، بعض کو تعلیم حکمت سپرد ہوئی اور بعض کا منصب تزکیہ ہے اور بعض جامع اوصاف ہیں۔
>
> صرف تلاوتِ کتاب کرنے والے حفاظ و قرآء ہیں۔ تعلیم کتاب کی خدمت انجام دینے والے علماء ظاہر ہیں اور حکمت کی تعلیم دینے والے علماء باطن اور محققین صوفیا ہیں اور تزکیہ کرنے والے آپ کی امت کے وہ اہل دل اور صاحبِ حال بزرگ ہیں جو آپؐ کے انفاس وانوار کے وارث وحامل ہیں۔
>
> انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کے لئے اور ان کی برکات پہنچانے کے لئے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب و حکمت کی تعریف۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ تعلیم ہے اور وہ تربیت اور تکمیلِ انسانیت کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔
>
> اعلیٰ تعلیم کے باوجود تزکیہ کی کمی اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس

www.abulhasanalinadwi.org

طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے۔

زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور امت کی اصلاح اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا۔ دونوں نے مل کر رسول اللہ ﷺ کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا۔ علماء ظاہر سے اگر لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی مرضی، اس کی خوش و ناخوشی کا حال اور شریعت کے احکام کا علم ہوا تو ان بزرگوں سے حقائق شرعیہ اور حکم الٰہیہ کا علم اور احکام پر عمل کرنے کا شوق وولولہ، مسابقت کا جذبہ، قلب میں تازگی و رقت، روح میں بالیدگی، طاعات میں سہولت واخلاص، تہذیبِ نفس اور طہارت اخلاق حاصل ہوئی، جن کو نصوصِ قرآن وحدیث میں لفظ 'احسان' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعد میں اسی تزکیہ واحسان کو لوگوں نے تصوف، طریقت، علم باطن، سلوک، مختلف ناموں سے یاد کرنا شروع کیا۔ اسی وقت سے یہ بحثیں پیدا ہوئیں کہ یہ چیز بدعت ہے یا سنت، فرض ہے یا واجب، مستحب ہے یا مباح اور شریعت و طریقت میں موافقت ہے یا مغایرت۔ پھر اس میں مختلف مذاہب اور گروہ ہو گئے اور یہ ایک بہت بڑا اختلافی مسئلہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ ظاہر و باطن کی تقسیم ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اس پر مصالحت کر لی کہ شریعت و طریقت کی راہ الگ الگ ہے۔ رہنما الگ الگ ہیں اور رہ نورد الگ الگ حالانکہ یہ تقسیم سراسر بدعت ہے لیکن اگر خیال رکھا جائے کہ تزکیہ رسول اللہ ﷺ کا وہ وصف خاص ہے جس کو زبان وحی نے آپ ﷺ کے اوصاف کے تذکرے میں کبھی نظر انداز نہیں کیا تو یہ مباحث جنہوں نے بہت کچھ تلخی پیدا کر لی ہے اور دو محترم گروہوں میں جن میں سے ہر ایک کو دوسرے کی امداد کی ضرورت ہے بہت ہی دوری پیدا کر دی ہے، از خود ختم ہو جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح کتاب و حکمت کی تعلیم بعد میں ایک فن اور ''صناعت'' بن گئی اور اس کے لئے بہت سے علوم 'مقدمات' کتابوں اور اساتذہ کا ایک پورا ضروری سلسلہ پیدا ہو گیا اور دین کے خادموں نے اپنے

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے وقت میں پوری کوشش کی اور اہل حق نے اس کو بدعات میں شمار نہیں کیا بلکہ خدمتِ دین اور قربتِ خداوندی کا ذریعہ سمجھا۔ اسی طرح تزکیہ بھی رفتہ رفتہ ایک فن اور صناعت ہو گیا جس کے لئے تعلیم اور اساتذۂ فن کی ضرورت ہوئی۔ نیز ہر زمانہ کی صحت و مرض اور اہل زمانہ کے مزاج کے موافق ان اطباء امت نے قلوب و ارواح کا علاج کیا اور وقتاً فوقتاً اس 'طب نبویؐ' کی تجدید کرتے رہے"۔[1]

اس اقتباس کی روشنی میں مولانا موصوف کا یہ موقف واضح ہو جاتا ہے کہ تصوف اور تزکیہ و احسان میں صرف زمانی فرق ہے۔ جس حقیقت کو پہلے تزکیہ و احسان کا نام دیا گیا اسی حقیقت کو بعد میں تصوف کہا گیا اور اگرچہ قرآن و سنت کے لئے یہ لفظ اجنبی ہے مگر ان کو اس اجنبی لفظ سے کوئی وحشت نہیں ہے۔ اس کی قبولیت کی مضبوط شرعی دلیل موصوف نے ان لفظوں میں دی ہے:

"جیسا کہ حدیث متواتر کی تعریف اور اس کے قطعی الثبوت ہونے کی دلیل میں اہل اصول کہتے ہیں کہ "اتنی بڑی تعداد میں ہر زمانہ میں اس کی روایت کی گئی ہو کہ عقل سلیم اور انسانی آداب اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں کہ اتنے کثیر انسانوں نے غلط بیانی اور افتراء پردازی پر اتفاق کر لیا ہے اور یہ کسی سازش کا نتیجہ ہے

تاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرن ثانی سے لے کر اس وقت بلا انقطاع اور بلا استثناء ہر دور اور ملک کے خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا اور ساری زندگی اس کی اشاعت میں مشغول و سرگرم رہے اور ان کو اس کی صحت و افادیت کے بارے میں پورا یقین و اعتماد حاصل تھا، وہ اپنے ماحول و معاشرہ کا خلاصہ اور عطر تھے، اور نہ صرف اپنی راست بازی، خلوص و بے غرضی، پاک نفسی اور نیک باطنی میں، بلکہ کتاب و سنت کے علم، سنت کی محبت و عشق اور بدعات سے نفرت و کراہت میں بھی اپنے معاصرین میں فائق و ممتاز تھے، ایک دو کا، یا دس پانچ کا کسی غلط

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سیرت سید احمد شہیدؒ، ج/دوم ص ۵۴۶/۵۴۸

www.abulhasanalinadwi.org

فہمی یا سازش کا شکار ہو جانا ممکن ہے اور بعید از قیاس نہیں لیکن لاکھوں انسانوں کا جو اپنے علم و عمل میں بھی امت کے صفِ اول میں نظر آتے ہیں، علی سبیل التواتر صدیوں تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا، اس پر اصرار کرنا اور اس کی دعوت کرنا اور اس پر پورے عزم اور استقامت کے ساتھ قائم رہنا خلافِ عقل اور خلافِ عادت بات ہے۔ پھر ان کے انفاس قدسیہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہدایت یافتہ اور فیضیاب ہونا اور اعلیٰ باطنی و روحانی کمالات تک پہنچنا خبر متواتر ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ عقلاً وعادتاً یہ بات بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ زمانی و مکانی اختلاف کے باوجود صادقین و مخلصین کا یہ گروہ عظیم متواتر و مسلسل طریقہ پر ایک غلط فہمی میں مبتلا رہا۔"[1]

مولانا موصوف تصوف کو نہ صرف لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے صحیح اور برحق تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک مکمل الہامی نظام ہے جو ہر قسم کے خطرہ اور ضرر اور انفرادی کمزوریوں اور غلط فہمیوں سے پاک اور محفوظ ہے"[2] "اس سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع عظیم پہنچتے رہنے کے ساتھ مہیب فتنہ و رخنہ کا سدباب بھی ہوتا رہتا ہے"[3] "یہ الہامی نظام سلسلۂ وحی کے منقطع ہو جانے کے بعد غیر منقطع الہام اور مسلسل مدد الٰہی کا دوسرا نام ہے"[4]

حتیٰ کہ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ دوٹوک اور حتمی بات بھی لکھ دی ہے کہ

"اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کرے گا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے"[5]

اس دوٹوک اور فیصلہ کن اعلان کے علاوہ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا موصوف تصوف کے طرفدار ہیں اور تصوف سے وحشت میں مبتلا ہونے والوں کو صحیح نہیں سمجھتے، برصغیر کی ایک دینی جماعت یا تحریک، جماعت اسلامی سے ۳ سال کی رفاقت کے بعد ان کا یہ کہہ کر قطع تعلق کر لینا کہ جماعت کے متعلقین میں اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک ص ۳۰
۲۔ // // // // // ص ۲۶
۳۔ // // // // // ص ۲۸
۴۔ // // // // // ص ۲۹
۵۔ // // // // // ص ۲۹

www.abulhasanalinadwi.org

اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تصوف سے دوری اختیار کرنے والوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا خاندانی پس منظر بھی تصوف سے الگ نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنی تحریروں میں جس عمومی مزاج کی تشکیل کی کوشش کی ہے یا تصوف کو 'چنیا بیگم' لکھ کر جس انداز میں تصوف کو شریعت کا 'نامحرم" قرار دیا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ مولانا علی میاںؒ اور مولانا مودودیؒ کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، سو یہی ہوا۔ تین برس کے اندر ہی مولانا علی میاں، جماعت اسلامی سے بہت باوقار طریقہ سے الگ ہو گئے لیکن چونکہ ان کے مزاج و کردار پر تصوف کا گہرا اثر تھا جو انسان کو بنیادی طور پر انسان بنانے یعنی مقام عبدیت کی انتہا تک پہنچانے اور اخلاق کی تکمیل کا کام کرتا ہے اس لئے جماعت اسلامی سے قطع تعلق کے باوجود انہوں نے جماعت اسلامی یا بانی جماعت اسلامی کے خلاف کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو غیر معیاری یا غیر شائستہ ہو۔ خود ہی فرماتے ہیں:

> "لکھنؤ کی جماعت (جماعت اسلامی) کی ذمہ داری اور رہنمائی کے دوران (جس کی مدت غالباً ۳ سال کے قریب رہی ہوگی) میرے اندر ۳ تاثر واحساسات پیدا ہوئے جنہوں نے مجھے جماعت سے وابستگی اور اس کی افادیت پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔
>
> ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں بڑا غلو پیدا ہوتا جارہا ہے اور وہ ان کے علاوہ کسی اور مفکر، مصنف اور داعی کے متعلق کوئی بلند خیال قائم کرنے، اس پر اعتماد کرنے اور اس کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے روز بروز دور ہوتے جارہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا (اور بعض اوقات زبانوں پر بھی یہ بات آجاتی تھی) کہ ان سے بہتر کسی نے اسلام کو سمجھا اور پیش نہیں کیا اور کلی دین کے داعی وہی ہیں۔ یہ افراد زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ اور ملازمین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا دین کا جو کچھ مطالعہ تھا وہ مولانا ہی کی تحریروں کے ذریعہ تھا۔ وہ نہ صرف ہمارے سلف بلکہ معاصر علماء کبار کی دینی خدمتوں اور دینی تحقیقات سے بھی ناواقف تھے اور اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید اور اس کے علمبرداروں کے علمی و عملی کارناموں سے بالکل نابلد تھے۔ اس لئے کسی حد

www.abulhasanalinadwi.org

تک مغرور بھی تھے۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جارہا تھا اور علماء اور دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بے باک ہو رہی تھیں۔

تیسری بات یہ کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں ترقی اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔

ان وجوہ سے طبیعت کچھ افسردہ رہنے لگی اور یہ محسوس ہوا کہ کام صرف مولانا کی تحریروں کو پڑھنے، سنانے اور اس کی داد دینے میں منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسری طرف اپنا خود حال یہ تھا کہ غائبانہ مولانا کی تحریریں پڑھ کر جتنا تاثر ہوتا تھا اور خیالات میں توارد اور اس کی وجہ سے انجذاب محسوس ہوتا تھا، ملاقات اور زیادہ دیر ساتھ رہنے میں (بغیر کسی محسوس وجہ یا شرعی بنیاد کے) اس انجذاب اور وابستگی میں کمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہ خاندانی اثر تھا کہ طبیعت کسی نمایاں باطنی و روحانی کشش کے بغیر کسی شخصیت کی زیادہ گرویدہ نہیں ہوتی۔

یہاں تک کہ خود میں نے اس کی مولانا کو اطلاع دی اور مولانا نے مجھے یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔ میں نے اپنی علیٰحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا اور نہ اس وقت تک جب ۱۹۷۸ء میں میری کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" نکلی کوئی علانیہ تنقید کی۔ علیٰحدگی کے بعد بھی میرے دو قدیم شریف دوستوں کے سے تعلقات تھے جن میں بنیادی خیالات کا اختلاف اور طریقہ کار کا فرق پایا جاتا تھا۔ میرا جب پاکستان کا سفر ہوتا تو ان سے ملتا اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے سے اکرام واحترام کا معاملہ کرتا"[۱]

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودیؒ نے برصغیر کی دینی روحانی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے تصوف اور تصوف سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔ انہیں لفظ تصوف سے ویسی ہی وحشت ہوتی رہی ہے جیسی کارل مارکس کو مذہب اور مذہبی طبقہ کے نام سے ہوتی تھی۔ تصوف کے اثرات کو بھی مولانا مودودی نے بالکل اسی طرح پیش کیا ہے جس

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی ج ۱ص ۵-۲۴۳

www.abulhasanalinadwi.org

طرح کارل مارکس نے مذہب کے اثرات کو پیش کیا تھا۔

"بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے "یعنی" بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی ذہنیت، جس کے بعد پیر صاحب میں اور ارباب من دون اللہ میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوت تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف اور دل و دماغ پر بندگیٔ شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اس کے مربوب۔ پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی، معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوتِ واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بے چارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں اور واقعات کی دنیا میں ٹھہرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہے"۔[1]

لیکن جہاں انہوں نے معروضی انداز میں تصوف کے مزاج اور تقاضوں پر بحث کی ہے وہاں رد پر ان کے قبول کا جذبہ حاوی رہا ہے:

"تصوف کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ بہت سی مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہو گئی ہیں۔ جس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں وہ اور چیز ہے، جس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں وہ ایک دوسری چیز ہے اور جس تصوف کی ہم اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز ہے۔

ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیہ میں پایا جاتا تھا۔ مثلاً فضیل بن عیاض، ابراہیم ادہم، معروف کرخی وغیرہم رحمہم اللہ اس کا کوئی فلسفہ الگ نہ تھا، اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا، وہی افکار اور وہی اشغال و اعمال تھے جو کتاب و سنت سے ماخوذ تھے، اور ان سب کا وہی مقصود تھا جو اسلام کا مقصود ہے، یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء۔ اس تصوف کی ہم تصدیق

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تجدید احیائے دین ص ۱۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو زندہ اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا تصوف وہ ہے جس میں اشراقی اور رواقی اور زردشتی اور... ویدانتی فلسفوں کی آمیزش ہوگئی ہے، جس میں عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے شامل ہوگئے ہیں۔ جس میں مشرکانہ تخیلات و اعمال تک خلط ملط ہوگئے ہیں۔ جس میں شریعت اور طریقت اور معرفت الگ الگ چیزیں۔ ایک دوسرے سے کم و بیش بے تعلق، بلکہ بسا اوقات باہم متضاد بن گئی ہیں اور جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے کے بجائے اس سے بالکل مختلف دوسرے ہی کاموں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کو مٹانا خدا کے دین کو قائم کرنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جاہلیت جدیدہ کو مٹانا۔

ان دونوں کے علاوہ ایک اور تصوف بھی ہے جس میں کچھ خصوصیات پہلی قسم کے تصوف کی اور کچھ خصوصیات دوسری قسم کے تصوف کی ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اس تصوف کے طریقوں کو متعدد ایسے بزرگوں نے مرتب کیا ہے جو صاحبِ علم تھے، نیک نیت تھے، مگر اپنے دور کی خصوصیات اور پچھلے ادوار کے اثرات سے بالکل محفوظ بھی نہ تھے۔ انہوں نے اسلام کے اصلی تصوف کو سمجھنے اور اس کے طریقوں کو جاہلی تصوف کی آلودگیوں سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن اسکے باوجود ان کے نظریات میں کچھ نہ کچھ اثرات جاہلی فلسفۂ تصوف کے، اور ان کے اعمال و اشغال میں کچھ نہ کچھ اثرات باہر سے لئے ہوئے اعمال و اشغال کے باقی رہ گئے جن کے بارے میں ان کو یہ اشتباہ پیش آیا کہ یہ چیزیں کتاب و سنت کی تعلیم سے متصادم نہیں ہیں، یا کم از کم تاویل سے انہیں غیر متصادم سمجھا جاسکتا ہے۔ علاوہ بریں اس تصوف کے مقاصد اور نتائج بھی اسلام کے مقصد اور اس کے مطلوبہ نتائج سے کم و بیش مختلف ہیں۔ نہ اس کا مقصد واضح طور پر انسان کو فرائض خلافت کی ادائیگی کے لئے تیار کرنا اور وہ چیز

www.abulhasanalinadwi.org

بنانا ہے جسے قرآن نے لتکونوا شهداء علی الناس کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور نہ ان کا نتیجہ ہی یہ ہو سکا ہے کہ اس کے ذریعہ سے ایسے آدمی تیار ہوتے جو دین کے پورے تصور کو سمجھتے اور اس کی اقامت کی فکر انہیں لاحق ہوتی اور وہ اس کام کو انجام دینے کے اہل بھی ہوتے۔ اس تیسری قسم کے تصوف کی نہ ہم کلی تصدیق کرتے ہیں اور نہ کلی تردید، بلکہ اس کے پیروؤں اور حامیوں سے ہماری گذارش یہ ہے کہ براہ کرم بڑی بڑی شخصیتوں کی عقیدت کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے آپ اس تصوف پر کتاب وسنت کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالیں اور اسے درست کرنے کی کوشش کریں۔ نیز جو شخص اس تصوف کی کسی چیز سے اس بنا پر اختلاف کرے کہ وہ اسے کتاب وسنت کے خلاف پاتا ہے، تو قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی رائے سے موافقت کریں یا مخالفت، بہر حال اس کے حقِ تنقید کا انکار نہ فرمائیں اور اسے خواہ مخواہ نشانۂ ملامت نہ بنانے لگیں۔[1]

جس قسم کے تصوف سے مولانا مودودیؒ نے شدید بیزاری کا اظہار کیا ہے اس کو امام غزالیؒ ہی کے دور میں رد کیا جا چکا تھا اور جس قسم کے تصوف کی وہ مکمل طور پر تصدیق کرتے ہیں نہ تردید، اس میں اصلاح و تجدید کی کوشش خود اکابر صوفیہ اور مشائخ کا معمول رہا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، میر عبد الواحد بلگرامیؒ، شاہ ابو الحسن نوریؒ، شاہ تراب علی قلندرؒ اور مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ نے اس سلسلہ میں مجاہدانہ اور مجتہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔

جماعت اسلامی کے علاوہ جس جماعت یا مسلک کو تصوف سے بہت زیادہ وحشت ہے اور اس جماعت کی تصوف سے وحشت کا مولانا موصوف سے تعلقات پر بھی اثر پڑا ہے وہ جماعت اہل حدیث ہے۔ اس لئے اپنے محتاط اور عفو و درگذر کے رویّے کے باوجود مولانا نے اس جماعت کے متعلق مولانا عبد الرزاق ندوی کو لکھا تھا کہ:

'آنعزیز نے اپنے یہاں کے مرکز وادارہ کے جو حالات لکھے ہیں وہ خلاف توقع نہیں۔ اور اسی وجہ سے اس مکتب خیال اور اسکے قائدین سے پوری

۱۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، تجدید واحیائے دین، ص ۱۳۸-۱۴۰

www.abulhasanalinadwi.org

طرح مناسبت نہ ہو سکی"۔[1]

ذاتی نوعیت کے خطوط اور بے تکلف مجلسوں کے احوال ابھی پردۂ خفا میں ہیں اسلئے بہت سی باتوں کی تشہیر نہیں ہو سکی ہے لیکن اب دھیرے دھیرے بہت ساری باتیں سامنے آرہی ہیں۔ مولانا کے انتقال پر مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی مدظلہ نے اپنے ماہنامہ البلاغ (کراچی) میں جو تعزیتی مضمون شائع کیا ہے اس کے ساتھ مولاناؒ کے بعض خطوط بھی ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً انہیں ارسال فرمائے تھے۔ ایسے ہی ایک خط میں وہ رقم طراز ہیں کہ

"شاید آپ کے علم میں نہیں کہ ہندوستان اور سعودی عرب میں سلفیوں نے تبلیغی جماعت، دیوبندی جماعت، ندوۃ العلماء اور اس حقیر کی ذات کے خلاف ایک مہم چلا رکھی ہے۔ خود پاکستان سے دیوبندیت کے خلاف عربی میں ایک کتاب شائع ہوئی اور یہاں بھی آئی۔ اللہ ان لوگوں کو توفیق دے کہ .... وقت کے اصلی فتنوں اور خطرناک دشمن، دین مخالف محاذ کو اپنا نشانہ بنائیں"۔[2]

مندرجہ بالا خط میں جو شدید کرب چھپا ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا موصوف کہنا تو بہت کچھ چاہتے ہیں مگر ان کی اعلیٰ ظرفی ان کی زبان پہ تالا ڈال دیتی ہے۔ ان کی پوری زندگی بدگوئی سے محفوظ رہی ہے اور اگر کہیں کسی جماعت یا شخص کے بارے میں انہوں نے کوئی بات کہی بھی ہے تو بس اس انداز سے کہ ان کو پہنچنے والی تکلیف کا ہلکا سا اظہار ہو جائے۔

یہی طرز عمل اور بے نفسی تصوف کی روح ہے۔ میرؔ نے جو کہا تھا، علی میاں نے اس کو عملاً کر دکھایا یعنی

دور بیٹھا غبار میرؔ ان سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

انہوں نے اپنی نسبی، نسبتی اور روحانی کیفیات کے بیان میں جابجا یہ حقیقتیں بھی واضح کردی ہیں کہ ان کے لئے تصوف کوئی علمی ذہنی مشغلہ یا نظریاتی مسئلہ نہیں بلکہ نفس کی تہذیب، باطن کی صفائی اور روحانی کمالات کے اکتساب کا الہامی طریقہ ہے۔

وہ جس مقام پر جس خاندان میں پیدا ہوئے یا جن بزرگوں کی گود میں پلے بڑھے وہ ایمانی

۱۔ مولانا عبدالرزاق ندوی کے نام ۲۶ جولائی ۱۹۹۳، کا خط جب وہ الدار السلفیہ بمبئی سے وابستہ تھے۔
۲۔ ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ اپریل۔مئی، ۲۰۰۰ء ص ۱۶ بحوالہ البلاغ کراچی ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ

www.abulhasanalinadwi.org

لذت وحلاوت سے سرشار تھے۔ شاید قدرت نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جس مقام پر یا خاندان میں پیدا ہوں اس کی مثال پانی کے پاکیزہ چشمے جیسی ہو جو خود بھی صاف شفاف ہو اور جو اس سے رجوع کرے وہ بھی پاک صاف ہو جائے۔

اپنے جد اعلیٰ شاہ سید علم اللہ اور ان کی قیام گاہ جس کو بعد میں مولانا کا آبائی مسکن بننے کا شرف حاصل ہوا، کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"ملازمت سے پہلے ہی دنیا طلبی سے دل برداشتہ ہو کر خدا طلبی کی راہ اختیار کی۔ اسباب امارت کو وقف عام کر دیا اور دو سال لشکر گاہ میں ٹھہر کر نفس کی تہذیب و تربیت کے لئے خدماتِ شاقہ انجام دیتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اعظم حضرت سید آدم بنوریؒ کا آفتاب ہدایت وارشاد پورے عروج پر تھا۔ حضرت سید شاہ علم اللہ حضرت سید کی خدمت میں حاضر ہوئے، بیعت کی اور تھوڑی مدت میں اس راہ کے تمام منازل طے کر کے اس کے انتہائی کمالات حاصل کئے اور خلافت و نیابت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت سید آدمؒ نے اپنا عمامہ اور حضرت مجددؒ کی دستار مبارک عنایت کی اور وطن کی طرف رخصت کیا۔ شاہ صاحب رخصت ہونے لگے تو عرض کیا "اس طرف اودھ میں بہت سے اولیاء اور عالی مرتبہ لوگ ہیں۔ میری ان میں حیثیت ہی کیا ہو گی؟" حضرت سید آدمؒ نے کچھ دیر مراقب ہو کر فرمایا "ان میں تمہاری نسبت ایسی ہو گی جیسے چراغوں میں شمع کی" پھر کچھ دیر بعد مراقبہ کے بعد فرمایا "سید خاطر جمع ہو کر جاؤ اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری نسبت ان میں ایسی ہو گی جیسے ستاروں میں آفتاب کی۔

حضرت آدم بنوریؒ ہندوستان سے ہجرت فرما رہے تھے۔ شاہ علم اللہؒ نے بھی ہجرت کا عزم کیا۔ حضرت سید نے فرمایا" جا سکتے ہو، لیکن اگر کوئی مردِ خدا تمہیں کہیں روکے تو ٹھہر جانا۔"

شاہ علم اللہ صاحب اہل و عیال کو لے کر سفر حجاز کی نیت سے نصیر آباد سے رائے بریلی آئے، تو یہاں ایک خدا رسیدہ بزرگ شاہ عبدالشکورؒ مجذوب نے شیخ کا قول یاد دلا کر بہ اصرار رائے بریلی کے قیام پر آمادہ کر لیا اور سئی ندی کے کنارے ایک جگہ قیام کے لئے تجویز کر دی، شاہ صاحبؒ نے وہیں طرح اقامت

www.abulhasanalinadwi.org

ڈال دی۔ ۱۲۷۵ھ میں آپ نے حج کیااور واپس تشریف لائے اور کچھ مدت قیام کر کے تقریباً ۱۲۸۲ھ میں دوبارہ حرمین تشریف لے گئے۔ واپسی میں کعبہ کا نقشہ اور صحیح پیائش ساتھ لائے اور ۱۲۸۳ھ میں اسی نقشہ اور پیائش کے مطابق اپنے نئے مسکن میں سئی کے بالکل کنارے اپنے اور اپنی اولاد کے ہاتھ سے خدا کا گھر تعمیر کیا جس کی بنیادوں میں آب زمزم ڈالا اور اپنے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کی سنت کے مطابق اپنی اولاد کو وہیں اسی نیت سے آباد کیا"۔[۱]

اپنے خاندان کے بارے میں مزید تفصیل انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ

"خاندان علم اللہ کی جس شاخ سے مجھ ناچیز کا تعلق ہے اس کو سید صاحبؒ (سید احمد شہیدؒ) سے روحانی طریقے پر بہت گہرا اور مسلسل تعلق رہا ہے۔ میرے ددھیالی اور ننھیالی بزرگ سید صاحبؒ ہی کے سلسلہ سے وابستہ اور اس سلسلہ میں صاحب اجازت ہوئے ہیں"[۲]

نیز سید احمد شہیدؒ کے بارے میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

"ایک شب جمعہ کو آپ شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت ہوگئے اور آپ نے طرق ثلاثہ، چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ میں آپ کو داخل فرمالیا"[۳]

مجموعی طور پر اپنے خاندان کے بارے میں آپ نے بتایا ہے کہ

"اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندی اور حضرت مجدد دہلوی کی برکتیں اور نعمتیں جمع ہوگئیں"[۴]

خود مولانا بھی ان دونوں نسبتوں سے مالامال رہے ہیں۔ انہوں نے پہلے مرید اور پھر مرشد کی حیثیت سے بیعت وارادت کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے۔ زندگی کے گہرے تغیرات، ہمہ گیر اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے کسی صاحب دعوت سے گہرے ربط اور بیعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ بزرگوں سے فیض وافادہ، صحبتے بااہل دل کی کیمیا اثری اور خلق خدا کے لئے ان کے وجود کی نفع رسانی کے والہانہ تذکرے کئے ہیں۔ مثال کے طور پر تیرہویں صدی کے باکمال اور مشاہیر رجال کے عقیدتمندانہ تذکرے میں رقم طراز ہیں کہ:

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سیرت سید احمد شہیدؒ، جلد ۱ ص ۵۔۸۴

۲۔ // // // // ص ۱۹

۳۔ // // // // ص ۱۱۵

۴۔ // // // // ص ۹۵

www.abulhasanalinadwi.org

"تصوف و طریقت کو دیکھئے تو ہر سلسلہ کے ایسے اکابر شیوخ موجود تھے جنہوں نے اپنے طریق کو زندگی تازہ بخشی اور لاکھوں بندگانِ خدا ان کے انفاس قدسیہ سے بہرہ یاب تھے، سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ پر نظر ڈالئے تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ (متوفی ۱۲۴۰ھ) کی ذات گرامی پر نظر پڑے گی، جن کے فیوض سے ہندوستان، ترکستان، عراق و شام و روم فیضیاب تھے اور جن کے متعلق بہت سے اہل نظر کا خیال ہے کہ فیض و افادہ کے لحاظ سے اگر ان کو تیرہویں صدی کا مجدد طریقت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

حضرت شاہ غلام علی کے علاوہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی (متوفی ۱۲۱۸ھ) اور شاہ مراد اللہ تھانیسری (متوفی ۱۲۴۸ھ) لکھنؤ میں، شاہ محمد آفاق (متوفی ۱۲۵۱ھ) دہلی میں، شاہ حسین علی مکانوی پنجاب میں، شاہ درگاہی نقشبندی (متوفی ۱۲۲۶ھ) اور شاہ رؤف احمد مجددی (متوفی ۱۲۴۹ھ) رام پور و بھوپال کی ریاستوں میں، مولانا احمدی کرسوی، شاہ امین الدین کاکوروی (متوفی ۱۲۵۴ھ)، حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ قاضی عبدالکریم جوراسی اور ان کے خلیفہ قاضی عبدالکریم نگرامی (متوفی ۱۲۴۹ھ) اودھ میں نسبتِ مجددیہ کے حامل اور مرکزِ ہدایت و ارشاد تھے۔

سلسلۂ چشتیہ میں دیکھئے تو مولانا فخر الدین دہلوی کے خلیفہ و چشم چراغ مولانا قطب الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ)، شیخ صابر بخش (متوفی ۱۲۳۷ھ) اور شاہ میر محمدی (متوفی ۱۲۴۲ھ) دہلی میں، شاہ نیاز احمد بریلوی (متوفی ۱۲۵۰ھ) اور شاہ عبدالباری امروہوی (متوفی ۱۲۲۶ھ) روہیل کھنڈ میں، شاہ سلمان تونسوی (متوفی ۱۲۶۷ھ) پنجاب میں، شاہ علی اکبر فیض آبادی (متوفی ۱۲۱۰ھ) صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی (متوفی ۱۲۴۵ھ) شاہ کریم عطا سلونی (متوفی ۱۲۴۸ھ) اودھ میں، شاہ نعمت اللہ پھلواری (متوفی ۱۲۴۷ھ) بہار میں سلسلۂ نظامیہ اور سلسلۂ صابریہ کی برکات کے امین تھے۔

سلسلۂ قادریہ میں دیکھئے تو مولانا انوار الحق فرنگی محلی (متوفی

www.abulhasanalinadwi.org

۱۲۲۶ھ) لکھنؤ میں، سید آل احمد (متوفی ۱۲۳۵ھ) مارہرہ میں، شاہ اجمل (متوفی ۱۲۳۶ھ) الہ آباد میں، سید صبغت اللہ بن محمد راشد سندھ میں طالبین خدا کی تربیت وارشاد میں مشغول نظر آئیں گے"۔[1]

بیرون ملک کے جن شیوخ اور پیرانِ طریقت کا آپ نے بڑے والہانہ انداز میں بار بار تذکرہ کیا ہے ان میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے علاوہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ بھی ہیں جن کے نام و کام کو علماء کی ایک جماعت رد تصوف کے لئے استعمال کرتی رہی ہے لیکن مولانا موصوف نے ان کے زمانہ کے اہل صلاح ورشد اور اصحاب علم کی شہادتوں کی روشنی میں ان کے ذوق و معرفت کے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی نشاندہی کی ہے:

"مدارج السالکین میں ابن قیمؒ نے جستہ جستہ شیخ الاسلام کے جو اقوال واحوال پیش کئے ہیں اور علامہ ذہبیؒ وغیرہ نے ان کے تذکرہ میں برسبیل تذکرہ ان کے اخلاق و اذواق، عادات و شمائل اور اشغال واعمال کا تذکرہ کیا ہے، اس کو سامنے رکھنے سے ایک منصف شخص اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ شیخ الاسلام کا شمار اس امت کے عارفین اور اہل اللہ میں کیا جانا چاہئے، اور اس کو اس بات کا وجدان حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ ان منازل پر فائز اور ان مقاصد سے بہرہ مند تھے، جن کے حصول کیلئے سالہا سال ریاضت، مجاہدہ، ائمہ فن سلوک کی صحبت اور دوام ذکر و مراقبہ کا راستہ بالعموم اختیار کیا جاتا ہے اور جس کو متاخرین صوفیہ نسبت مع اللہ سے تعبیر کرتے ہیں"۔[2]

"ربانیة لا رهبانیة" مولانا موصوف کی ایک مستقل عربی تصنیف ہے جو عرب خصوصاً نجدی حضرات کی تصوف سے وحشت کو دور کرنے کے لئے انہیں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔[3]

تصوف، تزکیہ و احسان یا بے ریا عبادت کا ان کا یہ بے پناہ ذوق اور اس کی بے خوف ترجمانی کوئی رسمی بات نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ علماء نجد کے سامنے اس مسئلہ میں زبان کھولنا جہاد کے مترادف تھا اور مولانا موصوف نے بے خوف ہو کر یہ جہاد کیا بھی کیونکہ

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سیرت سید احمد شہید جلد ۱، ص ۴۳۔۴۷

۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، ص ۱۔۵۰

۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، صحبتے با اہل دل ص ۲۲۷

www.abulhasanalinadwi.org

تصوف کا الہامی نظام اور تعلق مع اللہ انسان کو مصلحتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور مولانا موصوف کو تو خاندانی اور فطری دونوں اعتبار سے اسی مزاج و طبیعت سے مناسبت رہی ہے اور اسی لئے "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر کرتی ہے" کے مصداق وہ جو کہتے اور لکھتے تھے اس میں بلا کی تاثیر ہوتی تھی۔

انجمن اسلام ممبئی کے جس سیمنار میں یہ مقالہ اپنی ابتدائی شکل میں پڑھا گیا وہاں مولانا تقی الدین ندوی صاحب (پروفیسر العین یونیورسٹی، ابوظبی) بھی موجود تھے انہوں نے اسی اسٹیج سے اپنی تقریر میں بتایا کہ "ربانية لا رهبانية" کے موضوع پر مولانا موصوف نے جب مدینہ یونیورسٹی میں تقریر کی تو شیخ عبدالعزیز بن بازؒ جو سعودی عرب کے مفتی اعظم اور سب سے بڑی مذہبی شخصیت تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ جذب و اثر کی یہ بے پناہ کیفیت، ذکر و فکر، صحبت با اولیاء اور نسب و نسبت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ مولانا موصوف کو بھی جو یہ کیفیت و قوت حاصل تھی، اپنے عمومی خاندانی مزاج اور بزرگوں کی فیض تربیت کے سبب تھی۔ انہی کے لفظوں میں

> "اس خاندان کا رشتہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح سے شریعت اور طریقت سے مربوط رہا اور اس میں ایک طرف علماء ربانی پیدا ہوتے رہے تو دوسری طرف مشائخ روحانی جن میں سے بعض مشائخ کا سلسلہ دور دور پہنچا اور بڑے بڑے صاحب باطن عالی نسبت شیوخ اس سلسلہ میں منسلک نظر آتے ہیں۔ نیز یہ کہ اس خاندان کے افراد نے (جن میں تزکیۂ نفس اور دولت باطنی کے حصول کی طلب تھی) اپنے زمانہ کے صحیح العقیدہ داعی سنت اور صاحب کمال مشائخ کی طرف بلا تکلف رجوع کیا اور ان سے علمی فیض اور باطنی نعمت حاصل کی اور اس میں کسی خاندانی زعم یا احساس برتری کو حائل ہونے نہیں دیا۔ نہ بعد مسافت اور سفر کی مشقتوں کو خاطر میں لائے"[1]

اور جہاں تک ان کے مزاج و طبیعت اور تصوف سے فطری رغبت کا تعلق ہے خاندان کے عمومی مزاج کے علاوہ اس میں ان کی والدہ محترمہ کے خواب کو بھی بڑی اہم حیثیت حاصل ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ کا یہ وہ خواب ہے جس کے سبب انہوں نے اپنی والدہ (مولانا علی میاں کی نانی) کے تردد کے باوجود شادی کے لئے ہاں کر دی تھی۔ مولانا کی دادیہال اور ننیہال میں بہت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، کاروانِ زندگی جلد ۱، ص ۲۸

www.abulhasanalinadwi.org

قریبی اتصال تھا لیکن دادیہال کی عسرت و تنگدستی کے سبب نانیہال کے لوگ جو خوشحال تھے بجز مولانا علی میاں کے نانا کے جن سے مولانا علی میاں کے والد کے روحانی تعلقات تھے، اس شادی کے لئے راضی نہیں تھے لیکن مولانا علی میاں کی والدہ کے ہاں کر دینے کے بعد نہ صرف دونوں خاندان ایک ہوگئے بلکہ والدہ علی میاں تا عمر اس بشارت آمیز خواب سے تسکین حاصل کرتی رہیں۔

"ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اس مالک کریم رحمٰن و رحیم کی عنایت و مہربانی سے ایک آیت کریمہ مجھے حاصل ہوئی۔ صبح تک وہ زبان پر جاری تھی مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کر سکی۔ منہ سے نکلنا دشوار تھا اور اس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے۔ جب معنی دیکھے تو خوشی سے پھول گئی اور تمام فکر و غم کو بھول گئی۔ اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کیا اور اس خواب کو بیان کیا۔ ہر شخص سن کر رشک کرتا اور والد مرحوم تو خوشی سے رونے لگے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے۔ ترجمہ: سو کسی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے ان کے واسطے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک بدلہ اس کا جو کرتے تھے۔ (السجدہ۔۱۷)"[1]

اس بشارت آمیز خواب سے ظاہر ہے کہ مولانا علی میاں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کی پیدائش اور وجود کی کیمیا اثری کی بشارت دی جاچکی تھی۔ اس کے باوجود ان کی والدہ محترمہ نے اپنے بیٹے کی پرورش میں کوئی کمی یا کوتاہی نہیں کی اور عسرت و تنگدستی میں بھی انہوں نے کتنی خودداری کے ساتھ اپنے بیٹے کی پرورش کی اور سسرال کی لاج رکھی اس کا اندازہ اس بیان سے کیا جاسکتا ہے۔

" والدہ صاحبہ اپنے اس نئے گھر میں آئیں تو اس کا نقشہ انہوں نے وہی دیکھا جس کو وہ سنا کرتی تھیں۔ تنگی ترشی کا زمانہ کبھی فراغت کبھی فاقہ۔ گھر میں کئی کھانے والے اور دادا صاحب کی آمدنی برائے نام، اوپر نانی صاحبہ اپنی شفقت کی بنا پر اس ٹوہ میں رہتی تھیں کہ بیٹی کو کچھ تکلیف تو نہیں ہے؟ کبھی کسی ماما کو بھیجتیں کہ گھر میں کچھ پک رہا ہے یا نہیں؟ والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ جب میں کسی کو اپنے میکہ سے آتے دیکھتی تو چولہے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ جلا دیتی تاکہ معلوم ہو کہ کھانا پک رہا ہے حالانکہ اس میں پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ بعض اوقات نانی

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، ج/۱، ص ۳۔۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

صاحبہ اپنی فراست سے تاڑ لیتیں اور کھانے کا خوان لگا کر بھیج دیتیں" ۱

مولانا علی میاں کی والدہ محترمہ غیر معمولی ذہن و ظرف کی خاتون تھیں۔ ان کی دعا، آداب سحر گاہی اور اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں دلسوزی کو مولانا نے کئی جگہ انہی کے لفظوں میں نقل کیا ہے۔

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گذار دی۔ ان کے مرتبہ کیا تھے؟ شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، مولوی محمد ابراہیم صاحب اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب اور مولوی محمد امین صاحب جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی۔ کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی۔ یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ انگریزی مرتبہ والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں۔

علی اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو۔ اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخرو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں۔ آمین ثم آمین۔ یارب العالمین۔ ۲

"علی، ایک نصیحت اور کرتی ہوں بشرطیکہ تم عمل کرو۔ بزرگوں کی کتابیں کام میں لاؤ اور احتیاط لازم رکھو۔ جو کتاب نہ ہو وہ عبدو (مولانا علی میاں کے بڑے بھائی کی عرفیت) کی رائے سے خرید و۔ باقی وہ کتابیں کافی ہیں جس میں تمہاری سعادتمندی ظاہر ہوگی اور کتابیں برباد نہ ہوں گی اور بزرگوں کو خوشی ہوگی۔ اس سعادتمندی کی مجھے بے حد خواہش ہے کہ تم ان کتابوں کی خدمت کرو۔" ۳

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، کاروان زندگی جلد ۱، ص ۳۳
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، کاروانِ زندگی جلد ۱، ص ۱۲۲
۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، کاروان زندگی، جلد ۱، ص ۱۱۳

www.abulhasanalinadwi.org

ان خطوط سے اس پس منظر کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے جس میں ان کی پرورش اور تربیت ہوئی اور اسکے بعد جب آپ نے درس و تدریس کے لئے قدم باہر نکالا تو اسی دور میں اپنے استاذ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی لیکن استاذ موصوف نے اپنے عزیز شاگرد کو خود بیعت کرنے کے بجائے اپنے شیخ، حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب بہاولپوری کی خدمت میں دین پور ضلع خان پور بھیج دیا اور آپ بیعت سے سرفراز ہوئے۔ اس وقت خلیفہ صاحب کی عمر ۹۰ سال کے اوپر تھی۔[۱]

بعد میں مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ایک روز تنہائی میں مولانا موصوف کو سلسلہ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی۔[۲] اور اس کے لئے انہوں نے مسجد خیف میں جو غیر معمولی دعاء استخارہ کا اہتمام کیا تھا اس کا ذکر کیا۔ دیگر سلسلوں کی اجازت آپ کو مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے حاصل ہوئی۔ خود ہی لکھتے ہیں۔

"......۲۶/اپریل ۱۹۴۸ء کو ہمارے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کو دوبارہ شرف بخشا۔ وہیں ایک روز بے سان و گمان حضرت شاہ علم اللہؒ اور سید صاحبؒ کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا" میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحبؒ کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں"[۳]

اجازت و بیعت کے بعد آپ کے مزاج و طبیعت میں جو مزید انقلاب برپا ہوا اسکے ساتھ اس خواب کی مکمل تعبیر سامنے آگئی جو آپ کی والدہ محترمہ کو بشارت کے طور پر دکھایا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے زندگی بھر علمی و عملی سطح پر وہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو تصوف کی مروجہ اصطلاح اور دور آخر میں اس کے انحطاط اور تاریخ و سوانح کے غلط اور ناقص طریقہ سے پیش ہونے سے کہیں گم ہو گئی تھی یا جس حقیقت کو کسی احمق شاہ، کسی ملعون بابا، کسی چرسی مزار نشین یا کسی گنجیڑی تعویذ فروش کے تصوف نے ایک طرف اتنا بگاڑ دیا تھا کہ عوام و خواص کی متاع دین، دنیا لٹنے لگی تھی اور دوسری طرف بعض

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ، کاروان زندگی ، جلد ۱ ، ص ۱۲۸
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ، کاروان زندگی ، جلد ۱ ، ص ۳۲۵
۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ، کاروان زندگی ، جلد ۱ ، ص ۴۔۳۵۳

www.abulhasanalinadwi.org

بے توفیق علماء ظاہر نے فقہ باطن اور تزکیہ واحسان کی اس شکل کو عجمی بدعت قرار دے کر صوفیہ کے بافیض گروہ اور تصوف کے الہامی نظام سے مکمل دوری اختیار کرلی تھی۔

مولانا موصوف نے افراط و تفریط سے بچ کر شریعت و طریقت کو ایک دوسرے کا رفیق بتایا اور طریقت کو شریعت کا رقیب تسلیم کرنے کے بجائے اس کا لب لباب اور دین کی روح تسلیم کرنے پر اصرار کیا۔ یہی حقیقت بھی ہے اور تمام اکابر سلسلہ اور شیوخ طریقت اسی پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں خاکسار مقالہ نگار کے مرشد برحق اور خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کے صاحب سجادہ حضرت مولانا شاہ مصطفےٰ حیدر قلندر مدظلہ العالی کا ایک اقتباس جو اصل میں ان کے جد اعلیٰ حضرت شاہ تراب علی قلندر قدس سرہ کی فارسی تالیف "مطالب رشیدی" کے مقدمہ کا اردو ترجمہ ہے افادیت سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"سالک کے لئے سلوک میں پہلا مرتبہ راہِ شریعت ہے۔ شریعت کے صحیح شرائط کی پابندی کرنا چاہئے۔ جب اس معاملہ میں حتی الامکان کوشش کرے گا اور ہمت بلند رکھے گا تو شریعت کے ادا کرنے کی برکت سے اور بلند ہمتی کے ثمرہ سے طریقت اس پر ظاہر ہو جائے گی کہ جو دل کا راستہ ہے۔ جب حقوق طریقت ادا کرتا رہے گا اور حوصلہ عالی رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی آنکھ کے سامنے سے پردے اٹھا دے گا اور حقیقت کے معنی اس پر ظاہر کر دے گا۔ شریعت سے مراد معاملات پر نگاہ رکھنا اور طریقت سے باطن کی صفائی کرنا ہے یعنی بری عادتوں سے علیحدگی مثلاً کپڑوں کو نجاست لگ جانے سے بچانا شریعت ہے اور دل کو کدورت بشریت سے بچانا طریقت ہے یا قبلہ کی طرف رخ رکھنا شریعت ہے اور حضرت حق کی طرف دل کو متوجہ کرنا طریقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنی امت کو اپنی تحقیق کے مطابق راستہ بتلاتے اور اسی کے لحاظ سے طریقت کے راستے پر چلاتے ہیں۔ اگر امتیوں میں سے کسی کی ہمت بلند ہو اور یہ چاہے کہ وہ حقائق تک پہنچے تو اسے طریقت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے تاکہ عوام کے درجہ سے نکل کر خاص لوگوں کے گروہ میں آجائے۔[1]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا علی میاںؒ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب سجادہ مدظلہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری کا ذکر بے موقع ہے نہ بربنائے تعصب بلکہ تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۱۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر قدس سرہٗ، مطالب رشیدی، ص ۵۔۴

www.abulhasanalinadwi.org

اور تکیہ کاظمیہ کاکوری کے بزرگوں کے قلبی روحانی اور علمی روابط کی روشنی میں یہ ذکر بہت مستحسن ہے اور اس کا لحاظ خود مولانا علی میاں بھی کرتے رہے ہیں۔

بانی خانقاہ کاکوری عارف باللہ شاہ محمد کاظم قلندرؒ کی عظمت و بزرگی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود ان کے مرشد برحق کلید عرفاں شاہ باسط علی قلندرؒ نے کبھی تو انہیں فرط محبت سے گلے لگا کر ارشاد فرمایا تھا کہ "تمہارے لئے قطب الارشاد کی بشارت ہے۔"[1]

اور کبھی یہ تحریر لکھوائی تھی کہ

> "میرے عزیز ترین بھائی شاہ محمد کاظم قلندرؒ مقام ولایت میں اس بلند مرتبہ پر فائز ہو چکے ہیں جس سے بڑا اولیاء اللہ کے لئے کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ ان کو میں نے خلیفہ اور مجاز کیا۔ ان کا مرید میرا مرید اور ان کا مردود میرا مردود ہے۔"[2]

اس لئے اگرچہ آپ کو کسی اور سلسلہ سے نسبت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر شاید سلاسل کی ایک دوسرے میں نسبت مخفی کے سبب، سید محمد عدل عرف شاہ لعل رائے بریلویؒ کے خلیفہ مولانا شاہ احمد کرسویؒ نے آپ کو نقشبندیہ سلسلہ کی اجازت دی اور آپ نے ان کو قلندریہ سلسلہ کی۔ شروع میں آپ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلسلہ میں بعض شبہات تھے جو شاہ ولی اللہ کے پانچ رسائل سطعات، ہمعات، الطاف القدس، انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ اور القول الجمیل پڑھنے سے نہ صرف دور ہو گئے بلکہ اس سلسلہ سے آپ کو خصوصی مناسبت بھی پیدا ہو گئی۔ متاخرین صوفیاء میں آپ شاہ ولی اللہ کے بہت معترف تھے اور ان کے طریقہ کے اشغال و اوراد نیز اس سلسلہ کی اجازت شاہ ابو سعیدؒ سے حاصل تھی۔

شاہ ابو سعیدؒ، سید احمد شہیدؒ کے نانا اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کے روحانی سرپرست تھے اور اس سلسلہ میں تفصیلی مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ امام ربانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ ابو سعیدؒ، ٹیپو سلطانؒ، شاہ کاظم قلندرؒ، اورنگ زیب عالمگیرؒ، سید احمد شہیدؒ اور پھر خود مولانا علی میاں ندویؒ سب ایک ہی سلسلۂ روحانیت کی کڑی ہیں۔ مولانا محمد حسنی، برادر زادہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے خانوادہ شاہ علم اللہؒ اور خانوادہ شاہ محمد کاظمؒ کے خصوصی ربط و نسبت کو بہت شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے:

۱۔ مولوی حافظ تقی انور علوی کاظمی، تذکرہ گلشن کرم، ص ۱۹
۲۔ مولوی حافظ تقی انور علوی کاظمی، تذکرہ گلشن کرم، ص ۱۹

www.abulhasanalinadwi.org

"کاکوری کا مشہور سلسلہ عالیہ قلندریہ جو اپنی وسیع المشربی رواداری اور جذب و سرمستی میں مشہور ہے اس کے نامور مشائخ کے حالات زندگی اور سوانح واقعات میں ہمیں اس جگہ وہ رنگ صاف نظر آتا ہے جہاں خانوادہ علم اللہی کا اس کے ساتھ پیوند لگا ہوا ہے اور دونوں سلسلے کسی ایک شخصیت میں جمع ہو گئے ہیں۔ گویا ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر سے گزرتا ہے اپنی روشنی چھوڑ جاتا ہے۔ حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ م ۱۸۰۶ء - ۱۲۳۱ھ کو جو اس سلسلہ کے عظیم المرتبت بزرگ گزرے ہیں۔ شاہ لعل محمد صاحبؒ اور اس کے بعد شاہ ابو سعید صاحب نبیرہ سید آیت اللہ بن سید شاہ علم اللہؒ سے اجازت حاصل تھی"۔[1]

اسی خاندانی اور روحانی تعلق کے سبب مولانا علی میاںؒ خانقاہ کاظمیہ کے صاحب سجادہ حضرت مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر مدظلہ اور آپ کے برادر اصغر حضرت مولانا حافظ شاہ محمد مجتبیٰ حیدر قلندر مدظلہ کا بڑا اکرام فرماتے تھے۔ لکھنؤ کی کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تو فرماتے کہ سلسلہ مجددیہ آپ ہی دونوں بھائیوں کے دم سے قائم ہے اور جب کبھی خانقاہ کاظمیہ کاکوری جاتے تو پہلے فاتحہ خوانی کرتے اور ہمیشہ ساتھ میں شیرینی بھی لاتے اور حضرت صاحبان مدظلہم العالی کو نذر کرتے۔

مولانا موصوف خاصانِ خدا میں ہیں۔ اخفائے حال کے باوجود عبادت میں لذت و حلاوت، بزرگوں کے تذکروں کے وقت ان کی گم شدگی اور زیارت قبور میں رقت کو بہتوں نے محسوس کیا ہے۔ وہ کبھی مغلوب الحال نہیں ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ "شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو طریقت کو شریعت کا خادم بنانے سے ہی مجدد کا درجہ حاصل ہوا ہے۔"[2]

ان کی نگاہ میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا یہ قول بھی تھا کہ "تصوف نام ہی ہے قولاً فعلاً حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول اللہ ﷺ کا" اسی لئے انہوں نے بزرگوں کے ہر قول اور ہر فعل کو بھی آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا ہے بلکہ ان کی قبولیت کے لئے کتاب و سنت اور اجماع امت سے سند کی شرط رکھی ہے کیونکہ انہیں اس حقیقت کا شدت سے احساس رہا ہے کہ

"کتاب و سنت سے عدم اشتغال اور فن حدیث سے ناواقفیت اور اس

۱۔ سید محمد حسنی، تذکرہ شاہ علم اللہ ص ۱۸

۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، دعوت و عزیمت جلد چہارم، ص ۲۴۹

www.abulhasanalinadwi.org

کی صحیح اور اس کی مستند کتابوں سے محرومی کی بنا پر، خانقاہیں ایسے عقائد و اعمال کی آماجگاہ بن گئیں جن کی سند دین کے اصلی مآخذوں سے ملنا مشکل اور جن سے قرون اولیٰ کے مسلمان یکسر نا آشنا تھے"۔[1]

اپنے جد اعلیٰ سید احمد شہیدؒ کے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے دست حق پرست پر بیعت کے وقت شیخ کے حکم کے باوجود "تصور شیخ" سے سید صاحب کی باادب معذرت اور اس معذرت پر شاہ صاحب کی طرف سے سید صاحب کو "ولایت اولیاء" کی بشارت کو انہوں نے بڑے اہتمام سے بیان کیا ہے۔[2]

اسی طرح خانقاہی رسوم اور بزرگوں کے بتائے ہوئے اعمال و اشغال اور تصوف کی ہر کتاب کو بھی وہ معتبر نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ:

"ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور و مقبول شطاری شیخ محمد غوث گوالیاری کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا"۔[3]

حاصل کلام یہ کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صوفیہ کے طرفدار اور ذوق و میلان طبیعت کے اعتبار سے خود بھی صوفی ہیں لیکن ان کا تصوف متصوفانہ انتہاپسندی سے مملو نہیں ہے بلکہ شریعت کی بے ریا پابندی کا دوسرا نام ہے۔ انہیں اصرار ہے کہ "جنہوں نے اسلام میں مجددانہ اور مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے" کیونکہ "روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری لازمی نتیجہ شوق شہادت ہے اور مجاہدہ کی تکمیل جہاد ہے"۔[4]

اس لئے ان کے تمام ممدوح مثلاً حضرت علی مرتضیٰؓ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امیر عبدالقادر جزائریؒ، محمد احمد سوڈانیؒ، سید احمد شریف سنوسیؒ، حسن البناء اور ہندوستان

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، دعوت وعزیمت جلد چہارم، ص ۲۵۰
۲۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سیرت سید احمد شہید جلد اول، ص ۱۱۵
۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، دعوت وعزیمت جلد چہارم، ص ۲۵۰
۴۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، ص ۱۱۱

www.abulhasanalinadwi.org

میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ وغیرہ... سیف و تسبیح کے جامع تھے خود ان کے خاندانی بزرگوں کا بھی یہی حال رہا ہے اور مولانا موصوف نے اپنے خاندان کے اس خصوصی وصف کو بیان کرنے میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے۔

" اس خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اس کے اکثر تاریخی عہدوں میں قائم رہا، مردانگی، حمیت دینی اور جذبۂ جہاد ہے جس کو مجموعی طور پر عربی زبان کا قدیم لفظ "فتوہ" یا تھوڑے فرق و اختلاف کے ساتھ یورپ کے قرون وسطیٰ کی اصطلاح CHIVALRY ادا کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس تاریخ کے خاندان میں بار بار ان اولوالعزم قائدین یا مجاہدین کے نام آتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد میں حصہ لیا اور شہادت سے سرخرو ہوئے۔ شاہ علم اللہ صاحب کے ۳ صاحبزادے جہاد میں شریک ہوئے اور دو پوتے سید عظیم الدین بن سید آیت اللہ اور سید محمد جامع بن سید محمد احسن بن سید آیت اللہ اور ایک بھتیجے اور داماد سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ شہید ہوئے.......................

...... خاندانی روایتوں اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے تذکروں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سلطان شہید (ٹیپو سلطان) جو

ترکشِ مارا خدنگ آخریں

کا صحیح مصداق اور ہندوستانی مسلمانوں کی خودداری، مومن کی فراست اور مجاہد کی غیرت ایمان کی آخری نشانی تھے اور جس نے گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر شیر کی ایک دن کی زندگی کو ترجیح دے کر انگریزی افواج کے مقابلہ میں سری رنگا پٹنم کے معرکہ میں شہادت سے سرخرو ہو کر مسلمان بلکہ پورے ہندوستان کی عزت رکھ لی وہ اور ان کا خاندان حضرت شاہ ابو سعیدؒ اور ان کے جلیل القدر فرزند حضرت شاہ ابو اللیثؒ سے (جو سید شہیدؒ کے حقیقی ماموں تھے) بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ خود حضرت شاہ ابو للیث صاحب کا سفر حج سے واپسی ۱۲۰۸ھ (ٹیپو سلطان ۱۷۹۹ء - ۱۲۱۴ھ کی حیات میں) کوڑیار بندر پر (جو اب منگلور ریاست کرناٹک کہلاتا ہے اور اس وقت ٹیپو سلطان کی قلمرو میں شامل تھا) اترنا اور مختصر علالت کے بعد وفات پانا اور وہیں مدفون ہونا بتاتا ہے کہ اس مجاہد خاندان کے حضرت شاہ علم اللہ صاحب کی اس شاخ اور سید صاحب کے اجداد مادری سے عقیدت و ارادت کے مستحکم تعلقات تھے اور کیا عجب ہے

www.abulhasanalinadwi.org

کہ اس تعلق نے بھی اس جذبہ اور کردار کی تشکیل وتربیت میں حصہ لیا ہو جس کا اظہار اس خاندان کے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے نفرت اور اس کے ازالہ کے لئے جان کی بازی لگادینے کی شکل میں ہوا.....................

.... یہ وصف اس خاندان میں تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک نمایاں طریقہ پر قائم رکھا اور کچھ تعجب نہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذہنی نشوونما اور سیرت کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ رہا ہو.............

....

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رستخیز میں بھی اس خاندان کی ہمدردی اور جذبات اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تھے جو انگریزوں سے نبرد آزما تھے اس کے نتیجہ میں اس خاندان کے ایک ممتاز فرد میرے دادا مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب کو عرصہ تک بعض دیہاتوں میں مستور ومخفی رہنا پڑا۔ اس دور میں خاندان کے باصلاحیت افراد میں انگریزی حکومت کا متوسل ہونے کے بجائے، بندیلکھنڈ کی ہندو ریاستوں، ناگور، ریواں وغیرہ سے اور مسلم ریاستوں حیدرآباد اور بھوپال وٹونک سے تعلق ملازمت کو ترجیح دی ہے۔"[۱]

اور انہوں نے خود بھی کبھی "سرسوتی وندنا" اور کبھی "وندے ماترم" کے خلاف نعرہ جہاد بلند کر کے اس سلسلے کو آگے بڑھایا ہے نیز تمنا کی ہے کہ یہ سلسلہ کبھی نہ تھمے لیکن قرآن و سنت کی مکمل اتباع کے ساتھ۔

"میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا جس کا رواج عام ہوا اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا، نہ میں تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی وغلط فہمی سے بری سمجھتا ہوں اور نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس خلاء کو جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے، جلد پر کیا جائے اور تزکیہ واحسان اور فقہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا اور یہ سب منہاج نبوت اور کتاب و سنت کی روشنی میں ہو۔ بہر حال ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہوں یہ کام ضروری ہے"[۲]

۱۔مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی، کاروان زندگی، جلد ۱، ص ۲۳-۲۷

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، ص ۲۴

www.abulhasanalinadwi.org